تلخابه شیرین

تلخابه شیرین

قیمت غیر مجلّد ——— چار روپے

ابوالاثر حفیظ جالندھری کا تیسرا مجموعۂ کلام

تلخابۂ شیریں

اس مجموعہ میں 'نغمہ زار' اور 'سوز و ساز' کے بعد یعنی ۱۹۳۳ء
سے ۱۹۴۶ء تک کا متفرق کلام درج ہے

۱۹۴۶ء

ملنے کا پتہ - مجلسِ اردو، ماڈل ٹاؤن - لاہور

گیلانی الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام ضمیر احمد خاں صاحب غوری طبع ہوئی
اور مصنف نے دفتر مجلس اردو ماڈل ٹاؤن لاہور سے شائع کی۔

تلخابۂ شیریں

فہرست

نظمیات

اب خُوب ہنسے گا دیوانہ

وہ پیارے جو سُوئے عدم جاچکے ہیں

چند غزلیں چند شعر

دیباچہ

کسی دوست کو تکلیف دینے کی بجائے مَیں نے اپنے ہی قلم سے اِس کتاب میں چند صفحات شامل کرنا مناسب سمجھا ہے۔ کیونکہ نثر میں دُوسرا کوئی یہ طرزِ تحریر اختیار نہ کرے گا +

بقائمی ہوش و حواس کون پریشان نگاری کا مرتکب ہو۔ اور پھر مَیں کیوں ایسا نادر موقع ہاتھ سے جانے دُوں!

مَیں اپنے متفرق کلام کا تیسرا مجموعہ شائع کر رہا ہُوں۔ اس سے پیشتر نغمہ زار سنہ ۱۹۲۵ء میں شائع ہُوا، سوز و ساز سنہ ۳۳ء میں۔ اب یہ تلخابۂ شیریں، پُورے تیرہ برس کے وقفے سے +

یہ کوئی قابلِ قدر ترقّی نہیں جس پر سینہ تان کر فخر کیا جا سکے۔ "نغمہ زار" کی اشاعت کے بعد آٹھ برس کی مدّت میں، "سوز و ساز" بھی کوئی

مبسوط اور ضخیم کتاب نہ تھی۔ تاہم میرے لئے یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ رسالہ "مخزن" کی ادارت کے ساتھ ساتھ میں نے "شاہنامۂ اسلام" کی پہلی جلد لکھی، خود ہی شائع بھی کی۔ خود شائع کرنا میرے لئے لکھنے سے زیادہ پُرمعنی ہے۔ بچّوں کے لئے بھی لکھتا رہا، نثر میں چند افسانے بھی مرتّب کئے، پھر مخزن کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر "شاہنامۂ اسلام" کی دُوسری جلد بھی مکمل کر ڈالی۔ "سوز و ساز" اس دُوسری جلد کے ساتھ ایک ہی سنہ میں شائع ہُوا۔

لیکن ۳۳ء سے ۴۶ء تک تو ایک بڑا وقفہ ہے۔ اس عرصۂ دراز میں "شاہنامۂ اسلام" کی صرف تیسری جلد مکمّل اور شائع ہو سکی۔ چند صفحات کی دو ملّی نظمیں "پردہ اور تعلیم" اور "یہ ہماری انجمن" چھاپی گئیں۔ یہ ہنگامی اجتماعات کے لئے تھیں۔ ہاں ایک لمبی اور مستقل نظم "تصویرِ کشمیر" بھی کتابی صُورت میں نکلی۔ نیز بچّوں کے لئے گیت اور نظمیں جمع کیں۔ ان میں سے بہت کچھ میں ۱۹۲۵ء تک لکھ چکا تھا۔ اب اور چند لکھی گئیں اور چار چھوٹے چھوٹے مجموعوں کی صُورت میں مرتّب ہوئیں۔ خیر یہ ایک دُوسرا

موضوع ہے ——————

اور اب یہ چھوٹی سی کتاب تیرہ برس کی کاوشوں کا نتیجہ !

مجھ سے مواخذہ ہُوا ہے۔ ہونا چاہئیے تھا۔ میرے کام کو مفید جاننے والے محاسبہ کر سکتے ہیں۔ کوئی کسی دُوسرے کے سامنے جوابدہ نہ بھی ہو، جب بھی ندامت کسی ماخُوذ کرنے والے کی محتاج نہیں ہوتی۔ کیا اعتراف کے لئے لازمی طور پر اپنے سے الگ کسی ہستی کی ضرورت ہے؟ کیا آدمی خود اپنی ذات پر حکم نہیں لگا سکتا؟ سر اپنے سامنے بھی تو جھک سکتا ہے!

مَیں خود اپنے اُوپر فردِ جرم عائد کر چکا ہُوں۔ مَیں نے مراحلِ ادب میں وہ تیز رفتاری نہیں دکھائی جس کی مُجھ سے توقع تھی۔ مَیں اپنے اختیار کردہ مقصد کا سُست رَو خادم ثابت ہُوا ہُوں!

آج کیا، کسی دَور میں بھی، آرٹ نے اپنے غلاموں کے تساہل کو گوارا نہیں کیا۔ تخلیقی سینہ کاوی وہ معشوقہ ہے جو اپنے چاہنے والوں کی پلک تک جھپکنا پسند نہیں کرتی۔

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبوُد
لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نہ خواست

تاہم اے میری محبوبہ، اے میری زندگی کی مقصود، جتنا جی چاہے مُجھ پہ خفا ہولے، سزا دے لے لیکن عتاب کر حجاب نہ کر۔ مُجھ سے چہرہ نہ چھپا۔ میں کام چور نہیں، محتاط ہُوں۔ شاید ضرورت سے زیادہ!

تیرے ہی جمالِ جہاں آرا کی دیدِ مزید کے اشتیاق میں اپنی نگاہوں کو اور جلا دینے کے لئے سرمہ مہیا کر رہا ہُوں

یہی تو چشمِ حقیقت نگر کا سُرمہ ہے

نزع کا فرد دیدار دیکھتے جاؤ

جہاں بھی تھا، جس حال میں بھی تھا، آنکھیں تجھ پہ لگی تھیں۔ میری آوارگی غفلت نہ تھی، فرار و گریز نہ تھا۔ ہجرت تھی پلٹ آنے کے لئے —!

دیکھ تو سہی، تیرے ہی حریمِ ناز، تیرے ہی خانہ باغ کی تزئین و آرائش کے لئے نوادر جمع کر لایا ہُوں۔ میرے احساسات، میرے تجربات، پھُول اور کانٹے ——!

ہاں میں ان ہی کے لئے سرگرداں رہا ہُوں۔ شاہراہوں سے گذرتا ہوا۔ شاہراہوں سے دُور دُور۔ پگڈنڈیوں سے بھی ؛

پگڈنڈیاں شاہراہوں سے جا ملتی ہیں۔ شاہراہیں تیرے دربارِ عام کی

سیڑھیوں تک پہنچا تو دیتی ہیں، لیکن پلٹا بھی دیتی ہیں۔ آج کل ان پر بڑا ہجوم ہے آنے جانے والوں کا۔ آنے والے، جانے والے —! اور ان دونوں پر پھول برسانے والے۔ ڈھیلے پھینکنے والے بھی —!

پلٹ کر جانے والے بہت جوش میں ہیں۔ شور ہے، ہنگامہ ہے، ہر ایک دعویدار ہے کہ اسی نے تیری اصل صورت دیکھی ہے۔ ہر ایک دعویدار تیرے خدوخال بیان کرتا ہے۔ عالمانہ انداز تحکم سے۔ ان میں بڑا اختلاف ہے۔ مشاہدے کا اختلاف!

جھگڑتے ہیں، کف بھر لاتے ہیں، دست و گریباں ہوتے ہیں، ان کی عالمانہ زبانوں سے ایسی ایسی آوازیں نکلتی ہیں جیسے پتھر۔ تو سنے تو یقین نہ کرے کہ یہ تیری گفتگو ہے، تیرا تذکرہ ہے!

عینکیں فروخت ہو رہی ہیں۔ وہ جو تیری جلوہ گاہ کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں دھڑا دھڑ خرید رہے ہیں —— رنگین رنگین عینکیں۔ دبیز شیشوں والی خوردبینیں اور دوربینیں بھی۔

فوٹو گرافر بھی بک رہے ہیں۔ رنگا رنگ تصویروں کی بڑی مانگ ہے۔ اس بڑھتی ہوئی گرم بازاری نے تصویریں ارزاں کر دی ہیں!

مَیں نے یہ تصویریں دیکھی ہیں۔ اور جانتا ہُوں، پہچانتا ہوں جن کی یہ تصویریں ہیں۔ ان ماہرینِ حُسن نے تیری خادماؤں کی جھلک دیکھ لی ہے کیا تجھے یاد نہیں، تیری کچھ بہرے داریاں اور دربارِ عام کی سیڑھیوں کو گرد و غبار سے صاف رکھنے والیاں تیرے محلسرا کی حوالی میں بیرونی صدر دروازے سے باہر بھی رہتی ہیں۔

یہ تیرے جمال سے مالا مال ہو کر پلٹنے والے اہلِ نظر روایت فرماتے ہیں۔ کہ تو بُوڑھی ہو گئی ہے۔ تیرے نقاب پر جھریاں پائی گئی ہیں۔ اور تو کچھ نہیں ہے صرف روایتی غزل۔ !

مَیں ہنستا ہُوں، رو بھی دیتا ہوں۔ مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ غریب بیچارے تیری جلوہ گاہ تک نہ پہنچ سکے۔ تجھے دیکھ نہیں پائے۔ ان کو پلٹنے کی جلدی تھی۔ جلوس ان کا منتظر تھا ——— !

مَیں ان سے تعرّض کیوں کروں ؟ کہہ چکا ہُوں مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ تجھ سے کہتا ہوں۔ تیری شاہراہیں۔ ان لڑنے جھگڑنے والوں کی لکد کوبی سے پامال ہیں۔ پگڈنڈیاں بھی شاہراہیں بنی جاتی ہیں۔

تجھے یاد ہو گا، جب مَیں پہلے پہل تیری طلب میں نکلا تھا۔ کھیت کیسے

سہانے تھے۔ ان کی مینڈوں پر سے گنگناتا ہُوا، مَیں گذرا۔ وادیاں اور اُن کا اچھوتا حسن، پھر وہ دامنِ کوہسار ——— !

میرا پتھروں پر ڈگمگانا، مشکلات کی اُبھری ہُوئی چٹانیں، ان کی دھار دار اور تیز نوکوں پر اپنی آنکھوں کو تول تول کر رکھنا کتنا بھلا تھا۔ میرا عزم مجھے بلند کر رہا تھا۔ اس طرح تنہا چلنا ہی میرے ذوق و شوق کا انعام تھا۔ اور میرے عزم کو بڑھانے والا کون تھا، تیرے جلوۂ منتظر کے سوا ———

اپنی ہی روش پر چلنے اور اس پہلی چوٹی تک پہنچ جانے پر میری اُلفت مسرّت کے وہ گرم گرم معصوم آنسو۔ جن کی نمکینی اب تک میرے لبوں پر ہے جب تُو نے پہلے پہل نزولِ اجلال فرمایا تھا۔ محض میرا حوصلہ بڑھانے کے لئے مجھے اور آگے، اور آگے چلانے کے لئے۔

مجھے یاد ہے تیرے ارشاد پر مَیں نے اپنی نگاہ ان وادیوں پر ڈالی تھی جن سے ہوتا ہوا مَیں آیا تھا۔ نیچے، دُور دُور تک۔ تیرے حسن کے پرتو سے مملو۔ بچھی ہوئی لہلہاتی کھیتیوں کی بساط۔ اور اس بساط پر جمے ہُوئے مہرے ——— ! ایک دُوسری کو کاٹتی ہُوئی اور ایک دُوسری کے متوازی ہموار راہیں۔ اور ان پر دَوڑ دوڑ کر رینگنے والے ——— !

مجھے کیا خبر تھی۔ میرا اس طرح چلنا بھی پگڈنڈیاں بنائے گا اور میرے پیچھے

پیچھے میرے نقوشِ قدم کو مٹانے کے لئے چلنے والوں کی جد و جہد پھولوں کے ساتھ ساتھ ان پتھروں کو اور ان کانٹوں کو بھی کوٹ پیس ڈالے گی جن کی دھاروں اور نوکوں پر میرے چھالوں کی رنگینیاں نثار تھیں ؛

مجھے اُن سے شکایت کیوں ہو، ایک طرح سے ان کے حوصلے قابلِ داد ہیں۔ وہ آسانی چاہتے ہیں۔ بے خدشہ سفر!

لیکن ان کو چاہئے، کہ ان راہوں کو پاکیزہ رکھیں۔ تجھے ذرا سیاست کھانی پڑے گی۔ یہ مَیں اس لئے کہتا ہوں تاکہ تیرے ملک میں بسنے والوں کے دماغ پراگندہ نہ ہو جائیں۔ نجاست بیماری پیدا کرتی ہے ؛

اب پھر مَیں بڑے ہیر پھیر کے بعد اپنی پرانی روش پر۔ اور دوسری کٹتی ہوئی اور ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی راہوں سے کٹتا، کتراتا، اپنی نگاہ کی سیدھ پر تیرے خانہ باغ میں آگیا ہوں۔ مجھے کام کرنے دے۔ اپنی بسیرگاہوں کی چمن بندی کے لئے!

میرے شباب کی رنگین اور سادہ کلیوں اور جوانی کے شاداب و رنگین پھولوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے رنگ کے سدا بہار گل بوٹوں کی بہاریں دیکھ۔ تازہ تازہ تجربوں کے کانٹے بھی جن کو سمیٹ کر مَیں بڑی حفاظت سے لایا ہوں، اور جن کے منہ میرے اپنے ہی خونِ آرزو سے رنگین ہیں۔ دیکھ مَیں ان سے باڑیں سجائے دیتا ہوں رنگین پھولوں اور معصوم کلیوں کی حفاظت کے لئے!

لے رُوحِ زندگی، اے ملکۂ سخن، تُو نے خود ہی تو مجھے مالی بننے کے لئے منتخب کیا تھا۔ میں تجھی سے تو سیکھا ہُوں اور کون تھا میرا سکھانے والا ——!

آئیں تیری مانگ سنوار دوں۔ آئیں تیرے بال بنا دُوں۔ اگرچہ باہر آندھیاں زور پر ہیں۔ لیکن اب تجھے سادگی اور خوشی کی دولت تقسیم کرنے کے لئے باہر نکلنا ہے۔ ایوان پہلے سے اُٹے پڑے ہیں۔ تجھے ان مقبروں سے پرے اُن جھونپڑوں تک جانا ہے جن میں بسنے والوں کے پاس دلوں کی آنکھیں موجُود ہیں جن پر عینکیں نہیں لگائی جاتیں۔ چل ان دلوں پر اپنا پرتو ڈال۔ نگاہیں بانٹنے کا وقت آ گیا ہے۔

خیر تیرا درشن جھروکا بھی بند نہیں ہونا چاہئے۔ سیڑھیوں کے سامنے پھر ایک ہجوم ہے۔ یہ لوگ بھی تیری دید کے تمنّائی ہیں جلوۂ مستعار کے شیدائی۔ یہاں نقاب ڈالے رکھ، وہی لہریا نقاب ——— تیرا جلوۂ بے حجاب ان کی عینکوں پر گراں گذرے گا +

نغمہ زار ۳۵ء میں شائع ہُوا۔ لیکن اس میں جو کچھ درج ہے میری پچیس سال کی اوّلین کشتِ حیات میں سے پندرہ برس کی محنت کا سرمایہ ہے۔ ایک ہی برس کی پیداوار نہیں۔ اسی طرح سوز و ساز بھی ۳۳ء ہی میں خلا سے نمودار

نہ ہوا تھا ——— !

مَیں یہ فقرہ نہ لکھتا، لیکن مجھے شک ہے کہ عام مطالعہ کرنے والے ہی نہیں، تجزیہ اور تذکرہ فرمانے والے بھی کتاب پر درج شدہ سنِ طباعت سے اُدھر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں فرماتے۔ حالانکہ خود انہی کا قول ہے کہ شاعر کو اس کے ماحول کے تاثرات سے الگ نہیں کرنا چاہئے +

مَیں نے گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا آغاز کیا تھا۔ میری عمر آج چھیالیس برس اور گیارہ مہینے ہے۔ مَیں ۱۴ جنوری ۱۹۱۰ء کو پنجاب کے ایک پرانے قصبے جالندھر میں پیدا ہوا تھا +

موجودہ صدی اور مَیں ساتھ ساتھ چل رہے ہیں ——— ! کوئی اَور ہوتا تو اسی ایک بنا پر شاعری سے بھی بلند کوئی اور دعویٰ کر دیتا۔ یہ میرا احسان ہے کہ مَیں شاعر ہونے کا بھی دبی زبان سے ذکر کرتا ہوں ——— !

دبی زبان سے اس لئے نہیں، کہ مجھے اپنے ہمعصروں کی چُھری کلہاڑی اور دریدہ دہنی سے بعذرِ انکسار بچ نکلنے کی تمنّا یا توقع ہے +

نہیں۔ یہ بازو میرے دیکھے بھالے ہیں۔ جو کچھ یہ کہہ سکتے تھے، کر سکتے تھے۔ کہہ چکے، کر چکے۔ اس سے زیادہ کی توقع ان کی ہمّت و توفیق پر سوءِ ظن ہوگا الّا یہ کہ وہی آموختہ پھر دہرا دیں جس کی گردان ہر خادمِ زبان اور ہر صاحبِ قلم کے

بارے میں ان کے زبان و قلم سے ہوتی رہی ہے۔

۱۹۲۱ء میں جب مَیں نے پہلے پہل روایتی اندازِ سخن سے الگ ہٹ کر اپنے انداز سے لکھنا شروع کیا تھا، اسی وقت سے میرا ان سے سابقہ ہے۔ اُس وقت مَیں تازہ وارد تھا۔ دُنیائے شعر و سخن میں باغِ بہشت سمجھ کر "آزارے نیا شد" کے یقین پر داخل ہُوا تھا۔ مجھے خبر نہ تھی کہ یہاں جنگل کا قانون ہے۔

مجھے ایسی مخلوق کی بھیڑ بھاڑ میں سے بھی راہ نکالنی پڑی ہے جس کا شعور ابھی دبوچ لینے، تکا بوٹی کر ڈالنے اور کھا جانے سے آگے نہیں بڑھا۔ باغِ ادب ان کی شکار گاہ ہے۔ مجھے ان کے اِکّے دُکّے سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ ٹولیاں بھی مجھ پر لپکیں، جھپٹیں۔

پہلے یہ بھبکی دیتے ہیں۔ کوئی سہم جائے یا اُلجھ پڑے تو ہجوم کرتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے صرف ایک ہتھیار درکار ہے، بے پروا مسکراہٹ!

ان کو قتل کرنے میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے۔ یہ خود ایک دوسرے کے قاتل ہیں۔ ہاں جس کو مسکرا دینے کی توفیق ہو اُس سے یہ دُور بھاگتے ہیں۔ غرّاتے ہوئے، پلٹ پلٹ کر دانت دکھاتے ہوئے۔

ان کے سامنے چمکار کی ہڈی بھی نہ پھینکنا چاہئے۔ اس طرح یہ ایک دوسرے

پر پل پڑتے ہیں اور یہ منظر کچھ ایسا خوشگوار نہیں ہوتا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی سے خائف ہے۔ نہ جانے کس وقت جھنجھوڑ بھنبھوڑ ڈالے۔

ان کی باہمی گروہ بندی، دائمی نفاق کے لئے۔ ان کا مل بیٹھنا، ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جانے کی تمہید۔ ان کی خوش وقتی منافست اور منافقت!

اے راہیِ ادب، اے مسافرِ شعر و سخن، اگر تیرے پاس بے پروا مسکراہٹ کا زبردست عصا نہیں، تو اس باغ میں داخل نہ ہونا۔ اس جنگل سے نہ گذرنا۔

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مسکرائے جا

میں نے ۱۱ء میں اپنے ارادے سے شعر کہنا شروع کیا۔ غزل، کیونکہ یہی سکۂ رائج الوقت مجھ تک پہنچا تھا۔ اور ابتدا میں مشق کے لئے تھا بھی مناسب اور آسان لیکن انتہا میں دیکھا تو یہی غزل سخن کی دشوار ترین صنف پائی۔

میرے کنبے میں دُور دُور تک نہ شوقِ علم تھا نہ ذوقِ ادب —— !
شاعری ورثے میں نہیں ملی —— لاگ نہیں لگی۔ بیماری ہوا پر سوار آئی۔ مُجھے اس نے آلیا —— !

بچپن میں عام رسم رسوم کے ہنگامے، میلے ٹھیلے اور ان کے ساتھ ساتھ

مذہبی غلو، اور مذہبی بحثوں کے نظارے دیکھے۔ لڑکپن میں جنگِ عالمگیر، اور اس کی ہولناکیوں کی آوازیں —— اور اُن کے تاثرات عنفوانِ شباب کے ولولوں سے گتھے ہُوئے —— پھر جنگ کے بعد، ہندوستان میں رُوحِ آزادی کا عمل اور ردِ عمل۔ ترکی اور خلافت کے لئے عام اضطراب۔ وطن اور آزادی۔ شدھی تنظیم۔ یہ سب کچھ اور ایسا ہی اور بہت کچھ، میرے دماغ پر مبہم مگر میرے قلب کی گہرائیوں میں واضح اثر چھوڑتے ہُوئے گذرے۔ اِن بیجوں کو اُگنا تھا اپنے اپنے وقت پر، زمین اور وقت کی آب و ہوا سے غذا لیتے ہوئے۔

میرے گھرانے پر موت وارد تھی۔ اور میری جان پر نزولِ غم۔ میرے بھائیوں کو پلیگ، ہیضہ لئے جا رہے تھے اور مجھے قافیے اور غزل!

زندگی میرے سر پر ہر قدم تازہ ذمہ داریوں کا پہاڑ لا دتی اور شاعری مجھے ہانکتی تھی:-

اے مصوّر ایک تصویر اس طرح کی کھینچ دے
بارِ دوشِ بے کسی کوہِ گرانِ زندگی

انہی دنوں ایک مردِ باصفا ایک شاعر، صحیح معنوں میں شاعر یعنی ایک انسان فرشتۂ رحمت کی طرح نازل ہوا۔ یہ گرامی تھا۔ روایات و رسوم کی پابندی کے لئے میں اُس کے حضور گیا۔ اُس نے میرے سر پہ ہاتھ رکھا، اور کہا: ——

"اے میری خاکِ وطن کے ذرّے، تقلید سے درگذر۔ وہ زمانہ لدگیا! خاکِ صحرا ہونے سے کیا حاصل۔ ذرّہ نقاب اتار سکے تو آفتاب بن جاتا ہے ——!

شاگردی، رنگ، پیروی —— اُن کے لئے رہنے دے جن کے پاس اپنی ذات نہیں۔ تُو اپنی ہی رُوح کو اپنے قالب سے باہر نکال۔ اپنا ہی سینہ چیر دل اُبل پڑے گا روشنی بن کر۔ تیری اپنی آنکھوں کے لئے بھی اور جن کو اس کی ضرورت ہے ان کے لئے بھی!"

صاحب نظر کی اک نگاہ کافی ہوتی ہے۔ یہ قول کسی روایتی غزل کے شعر میں سنا تھا۔ روایتی شاعر کا یہ قول میرے لئے صداقت کا سرچشمہ بن گیا۔ میں نے اُسی وقت سے اپنا مقصدِ حیات شعروادب کو قرار دے لیا اور مصمم ارادے کے ساتھ وہ تمام راہیں بند کر دیں جو نگاہ و دل میں حائل تھیں +

ان دنوں میرا خیال تھا کہ روایتی ہو یا واقعی۔ شاعر صرف وہ ہوتا ہے، جس کا دل نرم، رُوح گرم ہو۔ ہمدرد ہو۔ دل آزاری جس کی سرشت میں نہ ہو جس کا ظاہر و باطن ایک ہو۔ کسی سے بھی کینہ وحسد نہ رکھے جس کو فطرت کی طرف سے نیک نفسی ودیعت ہو حسن اور صداقت جس کا نصب العین ہو۔ خدا کی مخلوق کا بہی خواہ ہو۔ سب سے محبت کرے۔ سب کا بھلا چاہتا ہو۔ گرے ہوؤں، مظلوموں، ستم رسیدوں کے لئے اس کا قلم سہارا بنے۔

زیردستوں کو اس کے شعر کی رُوح قوی کرے اور سوئے ہوؤں کو بیدار ——!

ظالم اور زبردست اس کی آواز سے لرزیں اور پسپت ہو جائیں۔ اُس کی آواز میں ذاتی غرض۔ ذاتی کینہ و حسد کا دخل نہ ہو ——!

یہ اور اسی قسم کے دوسرے خیالات ہر شاعر کے متعلق گرامی کی دید۔ حالی کی شنید، اور اقبال زندہ مثال نے میرے دماغ میں بھر دیئے تھے۔ مجھے یقین کامل تھا کہ میں ایسی خاص الخاص برادری میں شامل ہو گیا ہوں۔ جس کا ہر فرد پیکرِ لطف و اخلاص ہو گا۔ اور کیوں نہ ہو مادی سربلندی کی تمام امنگوں، دنیوی جاہ و ثروت کی تمام خواہشوں کو تج کر شاعر خدمتِ فن ہی کو اوڑھنا بچھونا بناتا ہے۔ وہ مشہور ہو یا غیر معروف۔ کامیاب ہو یا ناکام۔ اپنے ارادے اور اپنے فن کی وجہ سے دنیا بھر کا محسن ہے۔ اس کی سینہ کاوی اور دلفگاری نورِ سحر اور رنگِ شفق کی مانند کائناتِ حیات پر بیداری اور نشاط و انبساط کی تجلیاں برساتی ہے۔

اس لئے مجھے شاعروں سے اس شرف کی توقع نہ ہوتی تو اور کس سے ہوتی۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔

میرے ماحول نے ان طفلانہ خیالات کی تائید نہ کی۔ یہ دَور جس سے مَیں گذرا اور ہم سب گذر رہے ہیں۔ اس کا خمیر ہی شاید نفاق اور تکدّر سے ہوا

ہے۔ میں نے لُطف واخلاص دیکھے۔ مگر بہت کم النفاذ کالمعدوم۔ شاعروں کی کہانیوں میں وہ تنہا شرف جو شاعر کا طرۂ امتیاز تسلیم کیا گیا ہے خود کہانی بن گیا ہے۔

شاید وہ لوگ جنھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے یہ توقعات میرے دل میں جاگزیں کیں اور چلتے بنے۔ یہ روشنی اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔ اور یا اب ان نوجوانوں کی وجہ سے ظہور میں آئے جن کو مادرِ زندگی نے احساسِ اجتماعی کے نئے سانچوں میں ڈھالا اور اخوتِ انسانی کے آغوش میں پالا ہے۔ اگر وہ میرے زمانے والوں کے سائے سے بچ نکلے ——!

پرانی صدی اور پرانی تہذیب کے باقیاتِ صالحات میں وہ کہنہ سال بزرگ جن کو اگلے وقتوں کے کہہ کر ٹالا یا اور شرمایا جا رہا ہے۔ وہ بھی یہ جھلک لئے ہوئے چراغِ سحری ہیں۔

میں گوشہ نشین نہیں ہوں۔ مجھے اپنے عصر کے سخنوروں سے شرفِ ملاقات کے مواقع۔ بخت اور اتفاق نے سب سے زیادہ اور بار بار بہم پہنچائے ہیں اکثر نامی ناموروں سے نیاز حاصل رہا ہے۔ اور اُن سے بھی جو نام اور ناموری کے لئے لمبے لمبے ڈگ بڑھاتے اُسی ڈھرے پر چلے جا رہے ہیں۔ اسی ایک منزل کی طرف۔ جہاں ایک دوسرے سے نفرت اور ایک دوسرے کا قتل زندگی کا ثبوت ہے۔

اُس طرف سیاستِ وقت کی تلوار زبانِ اُردو اور اس میں جو کچھ ہے سب کا گلا کاٹ رہی ہے۔ اس طرف اسی زبان کے سب سے بڑے دعویدار اور محافظ

ایک دوسرے کی گردن مار رہے ہیں۔ یہ ہے ماحول میرے وقت کی اردو شعرو شاعری کا ——!

فلک بے مہر عالم دشمن و معشوق بے پروا
مرا بر آرزو ہائے نظیریؔ خندہ مے آید

فکر و تخئیل کی ان میں کمی نہیں۔ چاہیں، ارادہ کر لیں تو اپنے کردار و گفتار سے ہندوستان اور اس کے بسنے والوں کے لئے صبحِ امید بن سکتے ہیں۔ یہ تھوڑے نہیں ہیں دھاڑے کا دھاڑا ہے۔ ہر جگہ، ہر موڑ، ہر نکڑ پر ——!

ملک میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ شعر کی ضرورت و اہمیت بڑھ گئی ہے؛ آج ہندوستان بہت سے ٹیگور، بہت سے حاؔلی، بہت سے اقباؔل ڈھونڈتا ہے۔ اب شعر و شاعری چند خاص الخاص محفلوں میں ایک دوسرے کو سنا دینے اور واہ واہ سن لینے تک محدود نہیں رہی۔ ہندوستان کا شاعر محض کتاب میں نہیں، بلکہ بنفسِ نفیس عام و خاص کے اجتماع میں مطلوب ہے۔ نئے نئے اجتماعی سوالات اور مہمات کے حل میں تعاون کے لئے شہروں شہروں لوگ اپنے وقت کے شاعروں، اپنے زمانے کے سخنوروں کو دعوت دیتے ہیں۔ آنکھوں پر بٹھاتے ہیں — مرغِ بٹیر کی پالی دیکھنے کے لئے نہیں۔ زندگیٔ تازہ، حیاتِ نَو کا نغمۂ بیدار ان کی زبانوں سے سننے کے لئے۔ گفتار کی جھلک کردار میں، دیکھ کر ان کی راہوں پر چلنے کے لئے

تاکہ خوابِ بیداری کی تعبیر ہو سکے — سنو، ان میزبانوں سے شاعروں کے افسانے!

انفرادی عیوب سے کون خالی ہے۔ لیکن اپنے عیوب کی نمائش، اپنی کمزوریوں کی تبلیغ اور اس فخر و ناز کے ساتھ ——!

کیا شاعر کے لئے بھیڑیا ہونا ضروری ہے؟ لوگ پوچھتے ہیں —؟ اس دَور کے عوام بلکہ خواص بھی سمجھنے لگے ہیں۔ کہ شاعر لازماً بداخلاق ہوتا ہے۔ حتی الوسع اس کے سائے سے بچنا چاہئے۔ آزاد خیال شرفاء بھی اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کو اِن کی موجودگی میں پردے کی تاکید کرتے پائے گئے ہیں ؎

اب کون دبی زبان سے بھی اپنے آپ کو شاعر کہہ سکے گا!

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے، یہ ہے ناقابلِ رشک ماحول اور یہ ہے ناگفتہ بہ دَور —— کم و بیش اسی میں رہ کر 'نغمہ زار' 'سوز و ساز' مرتب ہوئیں۔ شاہنامۂ اسلام لکھنے کا خیال و احساس پیدا ہوا۔ تین جلدیں شائع کی گئیں۔ باقی زیرِ تکمیل ہیں۔ اور 'تلخابۂ شیریں' پیش کیا جا رہا ہے ؎

کیسے کہوں، مَیں نے یا میری شاعری نے ماحول سے اثر نہیں لیا لیکن 'نغمہ زار' کا دَور لڑکپن سے عنفوانِ شباب تک کا زمانہ ایک سلسلہ اُن

واقعات کا تھا جن کی ہر بات انوکھی، سہانی، خوشگوار تھی۔ خوشی حاصل ہو جانے پر خوشی۔ رنج و غم سے دوچار ہونے پر رنج و غم۔ مسکراہٹ، آنسو۔ کبھی طلب و تلاش۔ کبھی استغنا، انانیت، غم عشق کی جستجو، فکرِ روزگار سے گریز۔ زندگی کی اخلاقی ذمہ داریاں نباہنے کے لئے +

دیکھا نہ کاروبارِ محبت کبھی حفیظؔ

فرصت کا وقت ہی نہ دیا کاروبار نے

بے فکری، خود نظری، لطافت، نزاکت، رقص، آنچل، باغ و بہار، کہسار، ٹھنڈی ہوائیں، کالی گھٹائیں، بجلیاں، زلفیں، رخسار، تمنائے دید، سب ذاتی انفرادی خود فریبیاں "ابھی تو میں جوان ہوں" کا جلوس غزلیں، حادثات کے خلاف غم و اندوہ کی ڈھالیں، آرزو کی جھنکیں، تمناؤں کی ترنگوں کے افسانے، کہانیاں، سازِ حیات کے آغاز کے نغمے، اپنے محل پر اور ماحول کے روایتی پن کے سبب سے بے محل بھی۔ کچھ مفید کچھ غیر مفید۔ مبہم مبہم واضح واضح۔ شعور و امتیاز اور لاشعوری کا درمیانی برزخ ———!

"سوز و ساز" کے ڈانڈے بھی اسی سے ملتے ہوئے۔ یہاں جیسے گرد و پیش کے دھندلے پن سے یکایک ایک شعلہ اُٹھے۔ پردے اُٹھ جائیں

ہر منظرِ پیشِ نظر ہو۔ زشت بھی، خوب بھی۔ ایک خوشگوار یقین، کسی بات کو جاننے پہچاننے کا۔ پا لینے اور سمجھ لینے کا۔ اس پر اعتماد اپنی قوتِ اظہار پر۔ دل مطمئن، مگر رگوں میں حرکتِ حیات اس خیال سے تیز کہ دنیا اپنی ہے۔ سب کچھ اپنا ہے۔ غم بھی اپنا، خوشی بھی اپنی ——— !

نظر اور ذوقِ نظر دینے والے
عجب شے بنا دی ہے دنیائے فانی

تلخابۂ شیریں کیفیات ہیں اِن دونوں سے الگ ہے۔ اس میں انفرادی اور نظری انانیت کا نشہ اُتر چکا ہے۔ ایک نرالی دُھن، تازہ منصوبہ، نئی منزل درپیش ہے۔ وہ بیج اُگے ہیں اور بار آور ہو رہے ہیں۔ جو ماحول نے بوئے، تجربے نے جن کو ہوا و غذا بہم پہنچائی *

۱۹۳۳ء کے بعد کا ہندوستان اور اس میں بسنے والے ہم تم اور سب بڑے چھوٹے اب وہ نہیں جو پہلے تھے۔ مُلکی سیاسیات اور معاشیات کے عام اور معمولی مدّ و جزر کا دَور گذر چکا۔ تلاطم و طوفان کا زمانہ ہے *

فرد کی انفرادیت اگرچہ ختم نہیں ہو گئی۔ لیکن اجتماعیت اور اشتراکیت

کا زندہ و بیدار اور خوشگوار شعور پیدا و پنہاں ہم آغوشی کے لئے چاروں طرف بازو پھیلا رہا ہے۔ اب حسن و عشق سے زیادہ مہلک حادثے، زیادہ مہلک کشمکشیں ہر قدم پر ہر لحظہ رونما ہیں +

چناں قحط سالے شد اندر دمشق

کہ یاراں فراموش کردند عشق

سارے جہان میں جماعتی احساس کی جو آگ بھڑکی اور بھڑک رہی ہے، ہندوستان تک اس کی گرمی ہی نہیں شعلے اور لپٹیں پہنچ گئی ہیں۔ دوسری جنگِ عالمگیر کی بھٹّی نے بالواسطہ ہی سہی یہاں بھی کارفرمائی کی ہے۔ یہاں بھی اجارہ داری اور مختاری کی زنجیروں کے حلقے پگھلنے لگے ہیں ــــ محکوم و مجبور۔ کسان و مزدور۔ قوتِ سرمایہ اور ساماں کے مقابل اپنی فاقہ زدہ ہڈیوں کو آراستہ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ نئی آرزوئیں جو پوری ہو کر رہیں گی۔ نئے جماعتی احساس بیداری کا شعور کہیں رفتہ رفتہ کہیں بسرعت حسبِ حالات دلوں کی پنہائیوں تک پہنچ رہا ہے ــــ اور زندگی بن کر اُبھر رہا ہے ــــ یہ نئی زندگی کہیں برسرکار ہے، کہیں برسرپیکار +

اس کے مقابل بھی ــــ وہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور ہو گا۔ جو دوسرے ملکوں میں انہی حالات کے اندر ہو چکا ہے۔ لیکن ــــ جدوجہد کی بار بار ناکامی

اور نامرادی اب پیچھے ہٹنے کی تلقین نہیں کرتی - زندگی آگے بڑھنے ہیں ہے رہنما جو آگے بڑھا رہے تھے پیچھے رہے جاتے ہیں ـــــــ سب کی اپنی اپنی منزلیں ہیں ـــــــ وہ حیران ہیں کہ زندگی کی منزل اور آگے ـــــــ اور آگے کیوں ہے - وہ بے بال وپری کی ایسی اڑان دیکھنے کے متوقع نہ تھے ـــــــ اب بے بال وپری اُن کے روکے نہیں رُکتی ـــــــ احساسِ حیاتِ تازہ خود ہی بال وپر ہے - یہ احساس، یہ یقین اب جذباتی اور خیالی نہیں - حقیقی اور واقعاتی ہے - انفرادی نہیں، اجتماعی ہے -

"تلخابۂ شیریں" اس زندگیٔ نَو سے خالی نہیں ہے - غزلیں بھی ہیں - لمبی لمبی نظمیں بھی ہیں - ہلکے پھلکے گیت بھی - شاید سب میں اپنے وقت کے میووں کا رس ملے گا ـــــــ

میرے تجربوں کی ہلکی تلخی لئے ہُوئے شیریں -

حفیظ

۷ - دسمبر ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ——!

آپ کو تو یاد بھی نہ رہا ہوگا دسمبر ۲۷ء میں آپ محمد علی رحمہ کے ہمراہ سفر میں تھے۔ سکندر آباد کے سٹیشن پر مرحُوم نے مجھے زور سے کھینچا اور شفقت کے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ اور آپ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا۔ "دیکھو ذاکر یہ پنجابی شاعر! اِس سے کہو اپنا فرض ادا کرے"!

جب مرحُوم نے مجھے اپنی مضبوط گرفت سے رہا کیا تو مَیں نے پہلی مرتبہ حیرت سے آپ کا چہرہ دیکھا۔ آپ کی آنکھوں میں روشن تبسّم تھا۔ مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ ادائے فرض کے سلسلے میں آپ بھی اُسی راہ پر ہیں جو اُس "ٹُوٹی ہُوئی کشتی کے ملّاح" نے اختیار کر رکھی تھی ❊

آخر وہ بیت المقدس میں جا سویا۔ ہندوستان میں روشنی کی موجوں اور تاریکی میں کشمکش شدید تر ہوتی گئی۔ میں اس تلاطم میں ڈوبتے ابھرتے آپ کو دیکھتا اور آپ کی آواز سنتا رہا ہوں۔ میرے نزدیک اِس دور میں آپ کی جد و جہد اُن سب کے لئے ایک مثال ہے جو آپ کے قول "سیاست شدّت چاہتی ہے تعلیم مدّت" پر یقین رکھتے ہیں!

ہر شاعر "شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد" کہتا رہا ہے۔ لیکن آپ نے مدرسہ کی رُوح بدل دی ہے۔ اِس لئے میں پہل کرتا ہوں۔ اور اپنا یہ مجموعہ شعر آپ کے توسط سے اہلِ مدرسہ تک پہنچائے دیتا ہوں +

حفیظ

نوٹ:۔ "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملّاح" میری ایک نظم ہے جو مولٰنا محمد علی رح کی وفات پر لکھی گئی تھی۔

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا

صفیؔ

"غزل کی شاعری مرچکی ہے"

اِک شور مچایا جا رہا ہے ——— اور

شور مچانے والے کون ہیں۔ وہ۔ جو ابھی ابھی

پیدا ہوئے ہیں جن کی آنکھیں بھی نہیں کھلیں

— آنکھیں کھلیں گی۔ تو دیکھیں گے کہ

اُن کو جنم دینے والی شاعری ——— غزل

زندہ بھی ہے اور پائندہ بھی۔

پروردگارا

توہی بھروسا توُہی سہارا
پروردگارا، پروردگارا
منظور منظور اے اہلِ دنیا
اللہ میرا، باقی تمہارا
حاضر ہوں مَیں بھی، حاضر ہے دل بھی
دل بھی تمہارا میں بھی تمہارا
یوُں مَیں نے جیتی الفت کی بازی
اک بار کھیلا، سَو بار ہارا
یہ ناخدا ہے، اے اہلِ کشتی
شاید کسی وقت کرلے کنارا

سیراب کر دے دنیا میں ساقی
عقبےٰ کی تلخی مجھ کو گوارا

رُوئے فلک پر چھائی سفیدی
چمکا ہے شائد میرا ستارا

آنکھوں میں آنسو، لب پر تبسّم
اُن کا تصوّر، اپنا نظارا

جینا پڑے گا اے جانِ شیریں
کرنا پڑے گی تلخی گوارا

مٹی کے پُتلے کیا چاہتا ہے
بختِ سکندر یا تختِ دارا

عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی
وہ بھی نہ ہارے مَیں بھی نہ ہارا

پھر یہ جہنم کس کے لیے ہے
آمرزگارا، آمرزگارا

نیّت مری خراب نہیں

مرے مذاقِ سخن کو سخن کی تاب نہیں
سخن ہے نالۂ دل، نغمۂ رباب نہیں
اگر وہ فتنہ کوئی فتنۂ شباب نہیں
تو حشر میرے لیے وجہِ اضطراب نہیں
نہیں ثواب کی پابند بندگی میری
یہ اک نشہ ہے جو آلودۂ شراب نہیں
مجھے ذلیل نہ کر عذرِ لن ترانی سے
یہ اہلِ ذوق کی توہین ہے جواب نہیں

جو کامیابِ محبت ہو سامنے آئے

مَیں کامیاب نہیں، ہاں میں کامیاب نہیں

قفس میں زمزمہ پیرا ہے روحِ آزادی

صدائے مرغِ قفس ہے نفیرِ خواب نہیں

اُسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ

وہ بے حجاب سہی مَیں تو بے حجاب نہیں

سُنا ہے میں نے بھی ذکرِ بہشت و حور و طہور

خدا کا شکر ہے نیت مری خراب نہیں

سخنورانِ وطن سب ہیں آفتابِ کمال

تو کیوں کہوں کہ میں ذرّہ ہوں آفتاب نہیں

بیانِ درد کو دل چاہیے جنابِ حفیظ

فقط زبان یہاں قابلِ خطاب نہیں

جس کی سمجھ میں آ سکے

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکے اگر قصۂ غم سُنے گا کون
کس کی زباں کھُلے گی پھر ہم نہ اگر سُنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے

رونقِ بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکایتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں ہم سے نظر ملا سکے

ایسا ہو کوئی نامہ بر، بات پہ کان دھر سکے
سُن کے یقین کر سکے جا کے اُنہیں سنا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمیِ مزاجِ دوست
اب وہ کرے علاجِ دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہلِ دل
کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

وہ ہوش - کہ دیوانہ بنا دے

یا عقل کی اُفتاد سے دیوانہ بنا دے
یا عشق کی امداد سے فرزانہ بنا دے
یا پردہ اُٹھا دے رُخِ جانانہ دکھا دے
یا ذوقِ نظر سے مجھے بیگانہ بنا دے
یا کر دے مجھے اپنی حقیقت سے خبردار
یا میری حقیقت کو بھی افسانہ بنا دے
آخر کوئی صورت تو بنے خانہ دل کی
کعبہ نہیں بنتا ہے تو بُت خانہ بنا دے
دل عشق سے ڈرتا ہے، مبادا یہ تباہی
بستے ہوئے اِک شہر کو ویرانہ بنا دے

کرتا ہے تصوّر تیرا اس رنگ کی باتیں
سُن لے کوئی اِک حرف تو افسانہ بنا دے
پروازِ خرد کیا ہے نری پست خیالی
اے ہمّتِ عالی مجھے دیوانہ بنا دے
اب میری حماقت پہ تأسّف ہے تو کیوں ہے
کیا میں نے کہا تھا مجھے فرزانہ بنا دے
دیوانگیٔ عشق کے بعد، آ ہی گیا ہوش
اور ہوش بھی وہ ہوش کہ دیوانہ بنا دے
ہم خونِ جگر پی کے چلے جائیں گے ساقی
لے شیشۂ دل توڑ دے پیمانہ بنا دے
ہے عشق حفیظ ایک ہی نسخہ کہ جو مل جائے
اپنوں کو مرے حال سے بیگانہ بنا دے

مری نیّت خراب ہے

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے
مجھ کو نہ لے چلو مری نیت خراب ہے

ذرّے کا حُسن ذرہ نہیں۔ آفتاب ہے
مشکل یہ آ پڑی ہے کہ زیرِ نقاب ہے

ہے اِک یہی جھلک تو مری جانِ جستجو
کیوں مان لوں کہ آب نہیں ہی سراب ہے

او مبتلائے زیست ٹھہر۔ خود کشی نہ کر
تیرا علاج زہر نہیں ہے شراب ہے

ساقی تیری نظر نے یہ کیا کر دیا مجھے
جیسے رگوں میں خون نہیں ہے شراب ہے

نشہ شراب میں ہے نہ مستی شباب میں
اس رنگ سے بہشت میں رہنا عذاب ہے

ہے دستِ محتسب مرا جاں بخش ہجر میں
میں زہر پی رہا تھا وہ سمجھا شراب ہے

عرضِ سخن کا اب وہ زمانہ کہاں حفیظؔ
کہنے کا وقت ہے نہ سنانے کی تاب ہے

آدمی آخرِ کار کیا کرے

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے
نخلِ امید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے

دن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر
پردے ہی جب ہوں پردہ در۔ رُوئے نگار کیا کرے

عشق نہ ہو تو دل لگی، موت نہ ہو تو خودکشی
یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے

اہلِ ہوس بھی ہیں بہت، خیر نظر نہ آئیے
یہ تو مگر بتائیے، عاشقِ زار کیا کرے

موت نے کس اُمید پر، سونپ دیئے ہیں بحر و بر
مُشتِ غبار ہے بشر مُشتِ غبار کیا کرے

شمع بھی ہے رہینِ یاس، پھول بھی ہیں اُداس اُداس
کوئی نہیں ہے آس پاس، کُنجِ مزار کیا کرے

گریۂ شرم واہ واہ فردِ عمل ہوئی تباہ!
دیکھتے اک ہی گناہ روزِ شمار کیا کرے

اپنے کیے پہ بار بار، کون ہو روز شرمسار
ٹل گیا عذرِ پائدار، قول و قرار کیا کرے

حدِ ہنر نہیں حفیظ تیرے خیال میں کوئی
اہلِ کمال میں کوئی تجھ کو شمار کیا کرے

یہ ہماری زبان ہے پیارے

دل ابھی تک جوان ہے پیارے / کس مصیبت میں جان ہے پیارے

تو مرے حال کا خیال نہ کر / اس میں بھی ایک شان ہے پیارے

رات کم ہے نہ چھیڑ ہجر کی بات / یہ بڑی داستان ہے پیارے

تلخ کر دی ہے زندگی جس نے / کتنی میٹھی زبان ہے پیارے

جانے کیا کہہ دیا تھا روزِ ازل / آج تک امتحان ہے پیارے

ہم ہیں بندے مگر ترے بندے / یہ ہماری بھی شان ہے پیارے

نام ہے اس کا ناصحِ مشفق / یہ مرا مہربان ہے پیارے

کب کیا ہم نے عشق کا دعویٰ / تیرا اپنا گمان ہے پیارے

میں تجھے بے وفا نہیں کہتا! دشمنوں کا بیان ہے پیارے
ساری دنیا کو ہے غلط فہمی مجھ پہ تُو مہربان ہے پیارے
تیرے کوچے میں ہے سکوں، ورنہ ہر زمیں آسمان ہے پیارے
خیر فریاد بے اثر ہی سہی! زندگی کا نشان ہے پیارے
شرم ہے، احتراز ہے، کیا ہے؟ پردہ سا درمیان ہے پیارے
عرضِ مطلب سمجھ کے ہو نہ خفا یہ تو اک داستان ہے پیارے

جنگ چھڑ جائے ہم اگر کہہ دیں
"یہ ہماری زبان ہے پیارے"

کِھلتا جا مُرجھاتا جا

او دِل توڑ کے جانے والے دِل کی بات بتاتا جا
اب مَیں دِل کو کیا سمجھاؤں مُجھ کو بھی سمجھاتا جا

اے میرے مجروح تبسّم خشک لبوں تک آتا جا
پُھول کی ہست و بُود یہی ہے کِھلتا جا مُرجھاتا جا

میری چُپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہُوئی
اب وہ حکایت عام ہُوئی ہے سُنتا جا شرماتا جا

یہ دُکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شُکرِ نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہونا ہے ناصح عقل کی بات سُجھاتا جا

تجھ کو ابر آلود دِنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بہلاتا ہے باتوں سے بہلاتا جا بہلاتا جا

دونو سنگِ راہِ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب ہر ایک قدم پر دونو کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھُول کھلیں گے چُننے والے چُن لیں گے
سُننے والے سُن لیں گے، تُو اپنی دُھن میں گاتا جا

آخر تجھ کو بھی موت آئی، خیر حفیظؔ خدا حافظ
لیکن مرتے مرتے پیارے وجہِ مرگ بتاتا جا

مجھ کو خدا نے کیا دیا

کوئی دوا نہ دے سکے مشورۂ دعا دیا
چارہ گروں نے اور بھی درد کا دل بڑھا دیا

دونوں کو دے کے صورتیں ساتھ ہی آئنہ دیا
عشق بسورنے لگا۔ حسن نے مسکرا دیا

ذوقِ نگاہ کے سوا۔ شوقِ گناہ کے سوا
مجھ کو بتوں سے کیا ملا، مجھ کو خدا نے کیا دیا

تھی نہ خزاں کی روک تھام دامنِ اختیار میں
ہم نے بھری بہار میں اپنا چمن لٹا دیا

حسنِ نظر کی آبرو صنعتِ برہمن سے ہے
جس کو صنم سمجھ لیا اُس کو خدا بنا دیا

داغ ہے مجھ پہ عشق کا میرا گناہ بھی تو دیکھ
اُس کی نگاہ بھی تو دیکھ جس نے یہ گُل کھلا دیا

عشق کی مملکت میں ہے شورشِ عقل نامراد
اُبھرا کہیں جو یہ فساد، دل نے وہیں دبا دیا

نقشِ وفا تو مَیں ہی تھا، اب مجھے ڈھونڈتے ہو کیا!
حرفِ غلط نظر پڑا، تم نے مجھے مٹا دیا

خُبثِ دروں دکھا دیا، ہر دہنِ غلیظ نے
کچھ نہ کہا حفیظ نے ہنس دیا مُسکرا دیا

مے پئے ہُوئے مینا لئے ہُوئے

لَبِ شُکرِ چارہ ساز کا نغمہ لئے ہُوئے
دل نذرِ جاں گداز کا شکوا لئے ہُوئے

اب اشتیاقِ عرضِ تمنّا نہیں رہا
اب ہر کوئی ہے عرضِ تمنّا لئے ہُوئے

تو بیٹھے ہوں ہیں۔ یُوں نہ رہے ہر کوئی
پھرتا نہ مے پئے ہُوئے مینا لئے ہُوئے

میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے
اِک اَور زندگی کی تمنّا لئے ہُوئے

ساقی ہے آج کون کہ ہر کوزۂ سفال
آتا ہے ایک نُور کا دریا لئے ہُوئے

دریا سے موج اُٹھی، سُوئے دریا پلٹ گئی
مجھ کو لیئے ہُوئے میری توبہ لئے ہوئے

پروانہ دِل لئے ہوئے جل جائے بھی تو کیا
جلتی ہے شمع صُورتِ زیبا لئے ہُوئے

یہ لن ترانیاں ہیں تو اب کون آئے گا
بیٹھے رہو گے برقِ تجلّی لئے ہُوئے

مرُدودِ میکدہ کو بھلا مُنہ لگائے کون؟
بیٹھا ہُوں خانقاہ میں توبہ لئے ہُوئے

پیشِ خدا چلا ہُوں فرشتے ہیں ساتھ ساتھ
ساغر لئے ہوئے کوئی مینا لئے ہُوئے

احباب ہی نہیں ہیں تو کیا زندگی حفیظ
دُنیا چلی گئی میری دنیا لئے ہُوئے

آخر تم کیا یاد کرو گے

آخر اک دن شاد کرو گے
میرا گھر آباد کرو گے

پیار کی باتیں وصل کی راتیں
یاد کرو گے یاد کرو گے

زر کے بندو عقل کے اندھو
تم کیا مجھ کو شاد کرو گے

جب مجھ کو چپ لگ جائیگی
پھر تم بھی فریاد کرو گے

کس دل سے آباد کیا تھا
کس دل سے برباد کرو گے

میں نے اپنی قیمت کہہ دی
تم بھی کچھ ارشاد کرو گے؟

اور تمہیں آتا ہی کیا ہے
کوئی ستم ایجاد کرو گے

تنگ اگر اے بندہ پرور
بندے کو آزاد کرو گے

میرے دل میں بسنے والو
تم مجھ کو برباد کرو گے

حسن کو رسوا کر کے مروں گا
آخر تم کیا یاد کرو گے

حشر کے دن امید ہے ناصح
تم میری امداد کرو گے

جبر مرے اختیار کے

اپنے ہی دل کو مار لیا مار مار کے
دیکھے تو کوئی جبر مرے اختیار کے!

ہارے ہوئے ہیں معرکۂ اعتبار کے
مارے ہوئے ہیں وعدۂ دیدارِ یار کے

گنتے ہیں سانس زندگیِ مستعار کے
بیٹھے ہیں انتظار میں روزِ شمار کے

یہ قیدِ زندگی یہ ستم روزگار کے!
مدِّ نظر ہے کیا مرے پروردگار کے

کس منہ سے اے تو مجھے بے موت مار کے

جاؤ گے سامنے میرے پروردگار کے!

وہ کون تھے جو عشق کو اک کھیل جان کر

کھیلے بھی اور چل بھی دئیے جیت ہار کے

کیوں کھیلتا ہوں میں یہ کسی کو خبر نہیں

احباب پھیر میں ہیں جیت ہار کے

کشمیر ہے وہ جلوہ، مگر اُس کی راہ میں

فرقت کی وادیاں ہیں پہاڑ انتظار کے

تھے ہم ہی بد نصیب کہ راحت نہ پا سکے

یُوں ورنہ بار بار دن آئے بہار کے

کشمیر میں حفیظ جلے دل کی یادگار

ڈھیری ہے ایک راکھ کی نیچے چنار کے

ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا

مجھے شاد رکھنا کہ ناشاد رکھنا
مرے دیدہ و دل کو آباد رکھنا

ملیں گے تمہیں راہ میں بتکدے بھی
ذرا اپنے اللہ کو یاد رکھنا

اُنہیں بھی یہ ضد ہے کہ جو سر جھکا دے
اُسی کو تہِ تیغِ بیداد رکھنا

بھلائی نہیں جا سکیں گی یہ باتیں
تمہیں یاد آئیں گے ہم یاد رکھنا

وہ ناشاد و برباد رکھتا ہے مجھ کو
الٰہی اُسے شاد و آباد رکھنا

حفیظ اپنے افکار کی سادگی کو
تکلّف کی اُلجھن سے آزاد رکھنا

فریب کھائے جا

کبھی زمیں پہ کبھی آسماں پہ چھائے جا
اُجاڑنے کے لئے بستیاں بسائے جا

خضر کا ساتھ دیئے جا قدم بڑھائے جا
فریب کھائے ہُوئے کا فریب کھائے جا

نہیں عتاب زمانہ خطاب کے قابل
ترا جواب یہی ہے کہ مُسکرائے جا

اناڑیوں سے تجھے کھیلنا پڑا اے دوست!
سُجھا سُجھا کے انہیں چال مات کھائے جا

شراب خُم سے دیئے جا۔ نشۂ تبسّم سے
کبھی نظر سے کبھی جام سے پلائے جا

جانِ برادر خفا نہ ہو

میری کوئی خطا نہیں۔ مُجھ پہ خفا نہ ہو
اُس بُت کو دیکھ داورِ محشر خفا نہ ہو
چاہوں تو اب بھی جانبِ منزل پلٹ چلوں
گمراہ اس لئے ہوں کہ رہبر خفا نہ ہو
توہینِ حُسن آہ بھی ہے ضبطِ آہ بھی
دو نو طرح کہیں وہ ستمگر خفا نہ ہو
یہ بزمِ تلخ زہد یہ میٹھی مئے طہور
پیتا ہوں تا کہ ساقئ کوثر خفا نہ ہو

میری ہزار توبہ نثار اس عتاب پر
ساقی پلا پلا مجھے ساغر خفا نہ ہو

بے وقت، بے محل، کوئی مقصد نہ مدعا!
یوں عرض حال ہو تو وہ کیونکر خفا نہ ہو

نالے کو ضبط کرتے ہوئے دم اُلجھ گیا
کوشش یہ تھی کہ اب وہ مکرّر خفا نہ ہو

اپنے خدا پہ کھول تو دوں نکتے کا راز
لیکن یہ خوف ہے بتِ کافر خفا نہ ہو

اے مدعی یہ رنگ اُڑانا محال ہے
دیکھ اس غزل کو جانِ برادر خفا نہ ہو

ڈرتا ہوں اس نزاکتِ معنی سے اے حفیظ
اِک بد مذاق فربہ سخنور خفا نہ ہو

بعدِ فنا کیا ہوگا

ذکرِ بیدادِ بتاں پیشِ خدا کیا ہوگا
زندگی میں نہ ہؤا بعدِ فنا کیا ہوگا

ہر قدم جس کو نئی چال نہ چلنا آئے
وہ تو رہزن بھی نہیں راہنما کیا ہوگا

کوئی بھی اب تو ٹھہرتا نہیں معیارِ نظر
آدمی شانِ خدا ہے تو خدا کیا ہوگا

حاصلِ عشق ہے رسوائی بھی ناکامی بھی
حاصلِ عمر نہ جانے ابھی کیا کیا ہوگا

پھر کدھر جائیں گے راندے ہوئے بتخانے کے
درِ کعبہ بھی اگر وا نہ ہُوا، کیا ہوگا!

تیری گُفتار بہت تلخ ہے واعظ یہ بتا
خُلد کی پاک شرابوں کا مزا کیا ہوگا

مَیں گنہگار بھی نکلا تو بہت معمُولی
حشر میں اَور بُرا حشر مرا کیا ہوگا!

شیخ کے منہ سے تو نکلی ہیں مزے کی باتیں
ہم یہ سمجھے تھے بجز نامِ خدا کیا ہوگا

بُغض نے پھونک دیا گلشنِ اُردو کو حفیظ
آنسُوؤں سے ترے یہ باغ ہرا کیا ہوگا

وہ جانیں نہ جانیں

بتوں کی کوئی بات سچّی نہ مانیں
نہ اِن کے دہن ہیں نہ اِن کی زبانیں
لُٹاتے ہیں ایمان شیخ و برہمن
بڑی زرو لفظوں پہ ہیں دونوں دکانیں
جہاں اہلِ دل آگیا کوئی زد پر
کھنچے تیر اور جُھک پڑیں دو کمانیں
ہمیں عشق ہے اُن سے ہم جانتے ہیں
وہ سمجھیں نہ سمجھیں وہ جانیں نہ جانیں

نہ ٹوٹیں گی خاموشیاں بتکدوں کی
فضاؤں میں گونجا کریں گی اذانیں

جوانی گئی پھر بھی ہم اور ناصح
جہاں مِل گئے چِھڑ گئیں داستانیں

جنوں سے نہ اُلجھیں ابھی اہلِ دانش
ابھی کچھ دنوں عقل کی خاک چھانیں

بہت دن گذارے ہیں قیدِ سُخن میں
حفیظ آؤ آزاد ہونے کی ٹھانیں

زمانہ سازی

نہ چلے گی حشر کے دن یہ تری سخن طرازی
کہ تو نامۂ عمل پر۔ نہ شہید ہے نہ غازی

نہ متاعِ نور حاصل نہ تو حور ہی سے واصل
نہ تو خود فریب واعظ نہ تو سادہ دل نمازی

یہ حقیقتِ مجازی۔ تری داستانِ رندی
یہ درِ بتانِ ہندی ترا سجدۂ حجازی

تری زندگی ریا ہے۔ مگر اس کا غم ہی کیا ہے
کہ ابھی بچھا ہُوا ہے ترا دامِ پاکبازی

تو مجھے بھی دے رہا ہے شرفِ نیازمندی
تری شانِ بے نیازی تری شانِ بے نیازی

کوئی بات ہے کہ چُپ ہوں تجھے کامراں سمجھ کر
مُجھے بے زباں سمجھ کر نہ دکھا زباں درازی

سرِ سر بلند میرا۔ نہیں مستمند تیرا
مَیں شہیدِ عشقِ رُومی مَیں قتیلِ علمِ رازی

ترے ناز مَیں اُٹھاؤں۔ اگر اَب بھی دیکھ پاؤں
کوئی اِک نظر فریبی۔ کوئی ایک دلنوازی

یہ محال تو نہیں تھا مرے دوست دوست ہوتے
مگر اے حفیظ مجھ سے نہ ہوئی زمانہ سازی

داستانِ گمرہی اپنی

بہت ہی مختصر ہے داستانِ گمرہی اپنی
قدم گھر سے نکالا۔ اور منزل آگئی اپنی

خدا ناظر تھا اپنا اور حاضر تھی خودی اپنی
مگر بندے کے در پر جھک رہی تھی بندگی اپنی

اُٹھائے کیوں نہ طوفانِ ملامت عاشقی اپنی
سمندر پار سے لایا ہے دل اپنا خوشی اپنی

وہاں اک شوخیٔ رنگیں کی صورت میں دلِ سادہ
یہاں دُنیائے معنی بالارادہ سادگی اپنی

گُل اندر گُل بہار اندر بہار اُس حُسن کا گلشن
فقط اِک خارِ دامن کو نظر آئی کمی اپنی

نتیجہ کامیابی کیوں نہ ہوتا امتحانوں کا
جفا تھی مبتدی اُن کی وفا تھی منتہی اپنی

حسیں ہم ان کو سمجھے تھے مگر اِتنا نہیں سمجھے
کہ یہ دل کی لگی تھی یا فقط اِک دل لگی اپنی

جہانِ درد آخر لے لیا اِک دل کے بدلے میں
اِسی سودے میں سودائی نے پائی بہتری اپنی

حفیظ اربابِ دنیا جو بھی چاہیں شوق سے کہہ لیں
ہمیں اتنا ہی کہنا ہے کہ دنیا بس گئی اپنی

جو مَیں نے کبھی رونا چاہا

عشق نے حُسن کی بیداد پہ رونا چاہا
تخمِ احساسِ وفا سنگ میں بونا چاہا

آنے والے کسی طُوفان کا رونا رو کر
ناخُدا نے مجُھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

سنگدل کیوں نہ کہیں تیکدے والے مجُھ کو
مَیں نے پتّھر کا پرستار نہ ہونا چاہا

حضرتِ شیخ نہ سمجھے مرے دل کی قیمت
لے کے تسبیح کے رشتے میں پرونا چاہا

کوئی مذکور نہ تھا غیر کا۔ لیکن تم نے
باتوں باتوں میں یہ نشتر بھی چبھونا چاہا
دیدۂ تر سے بھی سرزد ہوا اک جرم عظیم
حشر میں نامۂ اعمال کو دھونا چاہا
مرتے مرتے بھی توقع رہی دلداری کی
رکھ کے سر زانوئے تقدیر پہ سونا چاہا
ہائے کس درد سے کی ضبط کی تلقین مجھے
ہنس پڑے دوست جو میں نے کبھی رونا چاہا
جنسِ شہرت بہت ارزاں تھی مگر میں نے حفیظ
دولتِ درد کو بے کار نہ کھونا چاہا

مجھ کو مرے خُدا سے پشیماں نہ کیجئے

اُن گیسوؤں میں شانۂ ارماں نہ کیجئے
خونِ مژہ سے دعوتِ مژگاں نہ کیجئے

کیا ناخدا بغیر کوئی ڈُوبتا نہیں
مجھ کو مرے خُدا سے پشیماں نہ کیجئے

مر جائیے نہ کیجئے ذکرِ بہشت و حُور
اِس خواب کو بھی خوابِ پریشاں نہ کیجئے

ہے بتکدے میں بھی اسے ایمان کا خیال
کیوں اعتبارِ مردِ مسلماں نہ کیجئے

آئینہ دیکھئے میری صُورت نہ دیکھئے
مَیں آئنہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجئے

بارِ نگاہِ لُطف اُٹھایا نہ جائے گا
احساں یہ کیجئے کہ یہ احساں نہ کیجئے

باقی ہو جو بھی حشر یہیں پر اُٹھائیے
مرنے کے بعد زیست کا ساماں نہ کیجئے

دوزخ کو دیجئے نہ پراگندگی مری
شیرازۂ بہشت پریشاں نہ کیجئے

شاید یہی جہاں کسی مجنوں کا گھر بنے
ویرانہ بھی اگر ہے تو ویراں نہ کیجئے

تو ہی عزیزِ خاطرِ احباب ہے **حفیظ**
کیا کیجئے اگر تجھے قرباں نہ کیجئے

خانہ خرابی

ناکامیٔ عشق یا کامیابی
دونوں کا حاصل خانہ خرابی

آنکھیں سیہ مست چہرہ کتابی
بادہ شبانہ جام آفتابی

پھولوں میں دو پھول رنگوں میں دو رنگ
لب لعل نابی عارض گلابی

دنیا و دیں سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا بن جا شرابی

اُن کا بہانہ برجستہ گوئی
میرا تبسّم حاضر جوابی

دیندار کر دے کافر بنا دے
یہ پردہ داری یہ بے حجابی

ہیں تختِ دل پہ سرکار، ورنہ
تختہ اُلٹ دیں ہم انقلابی

دربان سے ہوں دست و گریباں
الحمدللہ یہ باریابی

پایا گیا ہُوں

جہاں قطرے کو ترسایا گیا ہُوں
وہیں ڈُوبا ہُوا پایا گیا ہُوں
بہ حالِ گمرہی پایا گیا ہُوں
حَرَم سے دَیر میں لایا گیا ہُوں
بَلا کافی نہ تھی اِک زندگی کی
دوبارہ یاد فرمایا گیا ہُوں
سپُردِ خاک ہی کرنا ہے مُجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہُوں
فرشتے کو نہیں شیطان سمجھا
نتیجہ یہ کہ بہکایا گیا ہُوں

برنگِ لالۂ ویرانہ بے کار
کِھلایا اور مُرجھایا گیا ہُوں
اگرچہ ابرِ گوہر بار ہُوں مَیں
مگر آنکھوں سے برسایا گیا ہُوں
کوئی صنعت نہیں مُجھ میں تو پھر کیوں
نمائش گاہ میں لایا گیا ہُوں
بقولِ برہمن قہرِ خُدا ہُوں
بُتوں کے حُسن پر ڈھایا گیا ہُوں
مُجھے تو اِس خبر نے کھو دیا ہے
سُنا ہے مَیں کہیں پایا گیا ہُوں
حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑے زوروں سے منوایا گیا ہُوں

سفینہ سپردِ خدا ہو گیا

وفا جس سے کی بے وفا ہو گیا
جسے بُت بنایا خُدا ہو گیا

وہ اِتنا نہ سمجھے، یہ کیا ہو گیا
فدا ہونے والا فدا ہو گیا

ہَوا سے اُلجھتا رہا ناخُدا
سفینہ سپردِ خدا ہو گیا

یہاں ہم دُعائیں ہی کرتے رہے
وہاں اُس نے جو کہہ دیا ہو گیا

بنے شیخ صاحب مُحبِّ وطن
بُتوں کو بھی سجدہ ادا ہو گیا

بتوں کو تو خیر اِک شکایت بھی تھی
خُدا مفت میں کیوں خفا ہو گیا

ہَوا جس نے دُنیا کی کھائی حفیظ
اسیرِ کمندِ ہَوا ہو گیا

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں

جوانی کے ترانے گا رہا ہوں
دبی چنگاریاں سلگا رہا ہوں

مری بزمِ وفا سے جانے والو
ٹھہر جاؤ کہ مَیں بھی آ رہا ہوں

بتوں کو قول دیتا ہوں وفا کا
قسم اپنے خدا کی کھا رہا ہوں

وفا کا لازمی تھا اِک نتیجہ
سزا اپنے کئے کی پا رہا ہوں

خدا گنتی کھو بُت خانے والو
تمہارے ساتھ مَیں کیسا رہا ہوں

زہے وہ گوشۂ راحت کہ جس میں
ہجومِ رنج لے کر جا رہا ہوں

چراغِ خانۂ درویش ہوں میں
اِدھر جلتا اُدھر بجھتا رہا ہوں

نئے کعبے کی بنیادوں سے پُوچھو
پرانے بتکدے کیوں ڈھا رہا ہوں

نہیں کانٹے بھی کیا اُجڑے چمن میں
کوئی روکے مجھے میں جا رہا ہوں

ہوئی جاتی ہے کیوں بیتاب منزل
برابر چل رہا ہوں آ رہا ہوں

حفیظؔ اپنے پرائے بن گئے ہیں
کہ میں دل کو زباں پر لا رہا ہوں

میری شاعری

یہ نظم دہلی ریڈیو سٹیشن سے فروری سنہ ۴۲ء کے ایک ادبی
جلسے میں (جو ڈاکٹر تاثیر کی صدارت میں ہوا) سنائی گئی تھی۔

یہ نظم نہ لکھی جاتی۔ اگر "ستم ظریف" زمانہ تصریحات پر مجبور نہ کر دیتا۔۔۔ ۔۔۔۔ شعرائے قدیم میں سے آمیدی رازی نے شاید ایسے ہی مرحلے پر کہا تھا:۔

فغاں کاندریں لاجوردی قفس — چو من بلبلے را گرفتہ نفس
دریغا کہ در صحن ایں کہنہ باغ — چہ آوائے قمری چہ غوغائے زاغ
چو شد یاوہ یاوہ گویاں بلند — آمیدی لب از نکتہ سنجی ببند
خروس سحر چوں برآرد خروش — چہ ابلبل منت گردد خموش

مری شاعری ہے نظاروں کی دنیا

یہ نغمہ سرا جوئباروں کی دنیا

یہ ہنگامہ زا آبشاروں کی دنیا

فلک آشنا کوہساروں کی دنیا

یہ پھولوں کی بستی۔ بہاروں کی دنیا

یہی ہے مرے شاہکاروں کی دنیا

مری شاعری ہے نظاروں کی دنیا

مری شاعری چاندتاروں کی دُنیا

یہ رنگیں گھروندا طلسمِ زمانہ

کھلونوں کا ہے اِک بڑا کارخانہ

ہوا باندھنا اور غبارے بنانا

غبارے بنا کر فضا میں اُڑانا

مرے شعر کا شعبدہ ہے پُرانا

مری شاعری چاندتاروں کی دنیا

مری شاعری بخت یاروں کی دنیا

فلک شامیانہ ہے۔ پربت قناتیں

اسی اوٹ میں دیدہ و دل کی گھاتیں

ہجوم تمنا۔ خوشی کی۔ براتیں

جوانی کے دن۔ کامرانی کی راتیں

مرے شعر کی یہ کلمی ہیں وارداتیں

مری شاعری بخت یاروں کی دنیا

مری شاعری خارزاروں کی دُنیا

تہی دستی و پستی و خستہ حالی

بگولوں سے معمور پھولوں سے خالی

وہ بیشہ کہ ہے مزرعِ خشک سالی

جہاں ابر بھولا ہے دریا نوالی

نہ بھولی اُسے بھی مری فکرِ عالی

مری شاعری خارزاروں کی دنیا

مری شاعری شہسواروں کی دُنیا

بہادر۔ جری۔ سُورما۔ اور جیالے

قضا جن کی ڈھالیں۔ قدر جن کے بھالے

تہوّر کے گھوڑوں کی باگیں سنبھالے

چلے ہیں سُوئے رزمگہ عزم والے

مرے شعر ہیں غازیوں کے رسالے

مری شاعری شہسواروں کی دنیا

مری شاعری دل فگاروں کی دنیا

یہ فریادِ خاموش نیچی نگاہیں

یہ ارماں کہ مسدود ہیں جن کی راہیں

فریبِ وفا سے کہاں تک نباہیں

مرے دیدہ و دل ہیں ان کی پناہیں

مرے شعر آنسو مرے شعر آہیں

مری شاعری دل فگاروں کی دنیا

مری شاعری بے قراروں کی دنیا

وہ ذرّہ کہ راہِ سکوں میں مخل ہے

وہ قطرہ کہ صد آتشِ مشتعل ہے

وہ دیدہ کہ بیداریٔ مستقل ہے

وہ دل جس سے دل گرمیٔ آب و گِل ہے

مرے شعر میں بھی وہی ایک دل ہے

مری شاعری۔ بے قراروں کی دنیا

مری شاعری خاکساروں کی دنیا

بسیرا خس و خار و خاشاک پر ہے

نگہ ہاتھ ہر خوشۂ تاک پر ہے

اگرچہ سرِ بے خودی خاک پر ہے

دماغِ خودی اوجِ افلاک پر ہے

مرے شعر کی آنکھ ادراک پر ہے

مری شاعری خاکساروں کی دنیا

مری شاعری بادہ خواروں کی دنیا

چلے جامِ جم بھی۔ جمے بزمِ کَے بھی

مگر ساقیا دیکھ اِک اور شَے بھی

یہ فریاد میری۔ کہ ہے جس میں لَے بھی

یہ نالہ مرا جو ہے پابندِ نَے بھی

مرا شعر شیشہ بھی۔ نشّہ بھی مَے بھی

مری شاعری بادہ خواروں کی دنیا

مری شاعری دوستداروں کی دُنیا

یہ دنیا جہاں سے الگ اِک جہاں ہے

یہاں دلنوازی کا سِکّہ رواں ہے

یہاں آسماں ہے مگر مہرباں ہے

نہ جانے عداوت کی دنیا کہاں ہے

مرا شعر اخلاص کا ترجماں ہے

مری شاعری دوستداروں کی دنیا

مری شاعری غمگساروں کی دنیا

فلک مہر پرور زمیں مہ جبیں ہے
نہ وہ مہر دہر اور نہ یہ مہ گزیں ہے
فلک بھی حسیں ہے زمیں بھی حسیں ہے
وہ نور آفریں یہ ظہور آفریں ہے

مرے آئنے میں کدورت نہیں ہے
مری شاعری غمگساروں کی دنیا

مری شاعری ہے پیاروں کی دُنیا

وہ پیارے کہ سوئے عدم جا چکے ہیں

وہ کلیاں وہ غنچے جو مرجھا چکے ہیں

ترانے جو آرام فرما چکے ہیں

خزانے جنہیں لوگ دفنا چکے ہیں

مرے شعر میں زندگی پا چکے ہیں

مری شاعری ہے پیاروں کی دنیا

مری شاعری انتظاروں کی دُنیا

کبھی مَیں بھی ہو جاؤں آزاد شاید

اسیری کی گھٹ جائے میعاد شاید

سُنی جائے اک روز فریاد شاید

وہ بھولے سے کر لے مجھے یاد شاید

وہاں کام آئے یہ رُوداد شاید

مری شاعری انتظاروں کی دنیا

مری شاعری ہے اشاروں کی دنیا

فلک پر ہیں گردش میں چاند اور تارے

زمیں پر بہار و خزاں کے نظارے

برابر چلے جا رہے ہیں بچارے

کہ ذوقِ نظر دے رہا ہے سہارے

مگر کون سمجھے یہ نازک اشارے

مری شاعری ہے اشاروں کی دنیا

تصویرِ کشمیر

یہ نظم ستمبر ۱۹۳۶ء میں سری نگر کشمیر میں لکھی گئی -- اور ۳۸ء
میں کتابی صورت میں سر سید راس مسعود مرحوم کے دیباچہ کے ساتھ الگ
کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے -

حفیظ کا دل آئینہ خانہ ہے۔ دنیا کی رنگا رنگی آوازوں اور صورتوں کے لباس میں اس آئینہ خانے کی سیر کیا کرتی ہے۔ نغمہ بھی نالہ بھی زِشت بھی خوب بھی۔ کبھی مل جُل کر کبھی الگ الگ یہاں آتے ہیں اپنے اپنے عکس دیکھتے ہیں۔ مُسکراتے ہیں۔ بسورتے ہیں۔ اتراتے ہیں۔ منہ بناتے ہیں۔ اس گنبد میں قہقہے بھی لگاتے ہیں۔ آہ و بکا بھی کرتے ہیں ——————

جس طرح حفیظ نے کشمیر کو دیکھا اور محسوس کیا ہے اپنی سیاحت کے دوران میں خود مَیں نے بھی اسی نظر سے دیکھا اور اسی دل سے محسوس کیا تھا —————— لیکن یہ خیال کہ مَیں نے بھی اسی نظر سے دیکھا اور محسوس کیا تھا حفیظ کی کھینچی ہوئی اس تصویر کشمیر کو دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے ——

(اقتباس از دیباچہ سر راس مسعود مرحوم)

ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

معرکہ درپیش ہے جذبات کی تفسیر کا
ہو رہا ہے تذکرہ کشمیر میں کشمیر کا
کھینچنا تصویر کا لانا ہے جوئے شیر کا
رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا
لطف جب ہے کہہ اٹھے ہر نقش اس تحریر کا
"ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا"

چار سُو پہرے کھڑے ہیں ساکت و صامت خموش
تاجِ نورِ اِن کے سروں پر جسم ان کے سبز پوش
ایک ہی قانونِ قدرت کے ہیں یہ حلقہ بگوش
کچھ نہیں جز خدمتِ کشمیر کہساروں کو ہوش
روکتے ہیں راستہ ہر دشمنِ بے پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

بَرف کی اُونچائیاں برفاب کی گہرائیاں
رنگ و بُو کی شوخیاں، پھُولوں کی بے پروائیاں
سبز قالینوں پہ دیو داروں کی بزم آرائیاں
بنتے تنتے چلتے پھرتے ابر کی پرچھائیاں
آگے پیچھے دوڑنا تاریکی و تنویر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

بُرف کے دیو زاد تُودے نُور کے آئینہ دار
نُقرئی جھیلوں میں صبح و شام عکسِ زرنگار
نغمہ خواں جوشاں خروشاں آبشار و جوئبار
خندۂ قدرت گُل اندر گُل بہار اندر بہار

کیوں شگفتہ ہو نہ دل اک شاعرِ دلگیر کا
ایک پہلُو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ندّیاں ہر سُو تھرکتی ناچتی گاتی ہُوئی
کسمساتی لڑکھڑاتی پیچ بل کھاتی ہُوئی
آدمی کیا پتّھروں کو وجد میں لاتی ہُوئی
اپنی اپنی منزلِ مقصُود کو جاتی ہُوئی

کرتی جاتی ہیں نگاہوں پہ عمل تسخیر کا
ایک پہلُو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تا بہ دامانِ نظر چیلوں کے دیو داروں کے بَن
سینۂ ہر سنگِ خارا سے رواں نہرِ لبن
بُوالہوس کے واسطے لیکن یہ رستے ہیں کٹھن
مَر گیا سر پھوڑ کر ان پتھروں سے کوہکن

سُن لیا تھا نام بیچارے نے جُوئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دامنِ سُن مرگ سے قائم ہے فطرت کا سُہاگ
حُسن کی مُورت امرناتھ آئینہ ہے شیش ناگ
ہائے چشموں کی روانی ہائے چرواہوں کے راگ
اِک مری آنکھوں کی ٹھنڈک اِک مرے سینے کی آگ

نقشِ حیرت ہوں مجُھے یارا نہیں تقریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دل رُبا دوشیزگی ہے چہرۂ لولاب پر
حُسنِ سادہ ہنس رہا ہے عالمِ اسباب پر
کوثر و تسنیم غش ہیں اس ردائے آب پر
رشک ہے فردوس کو اس سبزۂ شاداب پر
آب میں مے کا اثر ہے خاک میں اکسیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عامیوں نے کہہ دیا کشمیر کو جنّت نشاں
ورنہ جنّت میں یہ حُسن و رنگ و شادابی کہاں
کیا ہے جنّت، چند حوریں اِک چمن دو ندیاں
خیر زاہد کی رعایت سے یہ کہتا ہُوں کہ ہاں
عالمِ بالا پہ ہے پَرتَو اسی کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خوبصورت کھیت بھی گلزار بھی کہسار بھی
خوبصورت پھول بھی اشجار بھی اثمار بھی
خوبصورت ہر بشر مفلس بھی اور زردار بھی
ظاہرِ کشمیر رنگیں بھی ہے اور پُرکار بھی
باطنِ کشمیر لیکن پیٹ ہے انجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حُسن کی افراط خوبی کی فراوانی یہاں
ہے نظر کو اعترافِ تنگ دامانی یہاں
بہرِ جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں
بے کس و محتاج لیکن نوعِ انسانی یہاں
نقش فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

وادیٔ کہسار پر ایسی بہار آئی ہوئی
نخلِ آدم زاد پر لیکن خزاں چھائی ہوئی
اِس قدر خوش رنگ کلیاں اور مُرجھائی ہوئی
راکھ میں چنگاریاں جیسے ہوں کجلائی ہوئی

حسرت آلودہ ہے چہرہ ہر جوان و پیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اِک طرف مہمان خوش اوقات خوش دل خوش لباس
ایک جانب میزباں! فاقہ زدہ تصویرِ یاس
اِک طرف مے کا نشہ، پھل کا مزہ، پھولوں کی باس
اِک طرف بے کیف مزدوری کا حاصل بھوک پیاس

اِک تماشائی ہے اِک فرزند ہے کشمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہائے جہلم کے یہ بجرے ہائے یہ آنچل کی اوٹ
چادرِ آبِ رواں دونوں طرف رنگین گوٹ
ہائے ہانجی کا یہ کنبہ جس کا سرمایہ ہے بوٹ
یہ مشقّت یہ فلاکت لب پہ نغمہ دل پہ چوٹ

شیر سے محروم ہے مالک ہے جو ئے شیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

سطحِ ڈل لرزاں، کنول رقصاں، شکارے ہیں رواں
ان کے اندر کچھ حسیں بھی پیارے پیارے ہیں رواں
لیٹے لیٹے خوابِ راحت کے سہارے ہیں رواں
آسمانِ حسن پر گویا ستارے ہیں رواں

نیم باز آنکھیں مگر ہر سو نشانہ تیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کشتیوں کی استراحت اور باغوں کی بہار
دِن چناروں کی فضائیں شب چراغوں کی بہار
ہے یہ زرداروں کی اور اُونچے دماغوں کی بہار
اِن کے جا کر دیکھتے ہیں دِل کے داغوں کی بہار
ہے دُھواں چُولھے کا ان کو مشغلہ کفگیر کا
ایک پہلُو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

جس کی محنت سے چمن میں بُوٹے گل پر خندہ ہے
اُس کا گھر تاریک اُس کا اپنا منظر گندہ ہے
نقش صنّاعی کا جس کی لوحِ دل پر کندہ ہے
اُس کی مجبوری کو دیکھو بندگی کا بندہ ہے
سانس لینے میں بھی اُس کو خوف ہے تعزیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مجمعِ اضداد ہیں دیہات بھی اور شہر بھی
موت بھی طاری ہے ان پر زندگی کی لہر بھی
اِس زمیں پر آسماں کا لُطف بھی ہے قہر بھی
اپنے بچّوں کے لئے یہ شہد بھی ہے زہر بھی

آب و گِل کا یہ عجوبہ ہے عجب تخمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لئے
یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لئے
زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کے لئے
مائیں جنتی ہیں یہاں بچّے غلامی کے لئے

ہر نفَس اِک سلسلہ ہے قیدِ بے زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

حاکم و محکوم کا کوئی نہیں ہے امتیاز
سب نگاہِ نازِ مغرب پر ہیں مجبورِ نیاز
یہ برہمن کے بھجن یہ شیخ صاحب کی نماز
کر رہے ہیں قیدِ نامحسوس کی رسّی دراز
ہے نگاہوں سے نہاں صیّاد اِس نخچیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

خیر ہم کو کیا غرض اس قوم کے حالات سے
بدگماں ہوتی ہے دُنیا اِک ذرا سی بات سے
ہم تو لُطف اندوز ہونے آئے ہیں باغات سے
ہم کو دلچسپی نہیں ہے مالیوں کی ذات سے
لطف کیوں کھوئیں ہم اپنی چشمِ لذّت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمۂ شاہی پہ آؤ لے کے اِک بوتل چلیں
شہر کے جھگڑوں سے گاندھربل کی جانب ٹل چلیں
آؤ ویری ناگ دیکھیں آؤ اچھّابل چلیں
ہستئ مزدور کو پیروں کے نیچے مَل چلیں

اِس کی یہ مسکین صُورت دام ہے تزویر کا
ایک پہلُو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں!
کم سخن، کمزور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں!
حُسن و صنعت کے لئے مشہور ہیں ہم کیا کریں!
اِن کے گھر افلاس سے معمُور ہیں ہم کیا کریں!

اِن کی صُورت ہے نوشتہ کاتبِ تقدیر کا
ایک پہلُو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھ کر باشندۂ کشمیر کو اندوہگیں
ہنستے ہیں اہلِ تماشا کوئی ہمدردی نہیں
غیر ملکی زائروں کو ہو گیا ہے یہ یقیں
جنّتی ہے مزدوری اس باغِ جنّت کی زمیں
یہ نتیجہ ہے کسی ناگفتنی تقصیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زائروں کا موسمِ گرما میں رہتا ہے ہجوم
جلوہ گر ہوتے ہیں صحنِ باغ میں مثلِ نجوم
منحصر مزدوریٔ ارزاں پہ ہیں ان کے قدوم
اہلِ دل کم بیشتر اُن میں نظر آتے ہیں شوم
یہ زمیں گوشہ ہے ان کی خانگی جاگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اِن کے دم سے رونقِ گُلمرگ شانِ پہلگام
لیکن اِن دونوں میں ہے بد ذوقیوں کا اژدہام
رات دِن آلُودہ کرتا ہے اِنہیں انبوہِ عام
حُسنِ فطرت کا نہیں ان کے دلوں میں احترام

کام ہے تفریح سے جذبہ نہیں توقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اصل میں انسان کا ذوقِ نظر ہے بے بساط
ڈھونڈتا ہے ہر جگہ یہ مرد و زن کا اختلاط
آدکھاؤں مَیں تجھے راہِ حصُولِ انبساط
"شام در باغِ نسیم و صبح در باغِ نشاط"

دیدہ و دل کے لئے ساماں ہے تطہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اِس سے بڑھ کر اور کچھ چاہے تو شالامار دیکھ
آنکھ رکھتا ہے تو یہ رنگِ گل و گلزار دیکھ
کچھ نہیں دیکھا ابھی۔ پھر دیکھ پھر اِک بار دیکھ
شانِ مغلیہ کے یہ مٹتے ہوئے آثار دیکھ
تو نے دیکھا ہے کہیں ایسا بھی فنِ تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا تجھے معلوم ہے یہ نہر کیوں ہے بے قرار
سر پٹکتے ہیں زمیں پر کس لئے یہ آبشار
سرو کیوں ہیں پا بہ گل اور دم بخود ہیں کیوں چنار
سر جھکائے کیوں کھڑے ہیں نخل ہائے بار دار؟
سبزہ کیوں مُنہ تک رہا ہے آسمانِ پیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کون جانے کس لیے رنگین گل روتے ہیں خون
اس حسین بارہ دری پر سوگ سا طاری ہے کیوں
مجھ عبرت کیوں کھڑے ہیں سنگِ موسیٰ کے ستون
کیوں شکستہ قلب فوّاروں کو ہے جوشِ جنوں
منتظر ہے باغ کس کے خواب کی تعبیر کا؟
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چشمِ شاعر کے ہیں آنسو اِن کو مٹی میں نہ رول
بے خبر انمول جوہر کو ترازو سے نہ تول
ایک گوشے میں ادب سے بیٹھ جا منہ سے نہ بول
او تماشائی! تصوّر شرط ہے آنکھیں نہ کھول
چشمِ دل سے دیکھ نقشہ گردشِ تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عامیوں سے کوئی کہہ دے بند کر دیں کھیل کود
باغ کو خالی کرے اہلِ نمائش کا وجود
ہو گئی ہے رات سو جائے کہیں بزمِ نمود
ہونے والا ہے یہاں اب پاک روحوں کا وُرود
پیش خیمہ آ گیا اک بزمِ خلوت گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اِک سہانی چاندنی رات اور شالامار باغ
دیکھ روشن ہو گیا ہر ایک لالے کا چراغ
خود بخود پُر کر لیے رنگین پھولوں نے ایاغ
غش پہ جانے لگا پامال سبزے کا دماغ
رنگ و بو کو بھی سہارا مل گیا تشہیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

مطرب آئے نے نواز آئے مزامیر آگئے
نغمۂ خاموش کی بن بن کے تصویر آگئے
دفعتاً بیرونِ در کچھ اہلِ شمشیر آگئے
اندرونِ در شہنشاہِ جہانگیر آگئے
ساتھ اک پُر نور حلقہ عدل کی زنجیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کا در پھر کھُلا بادِ بہاری آگئی
اِک ردائے سبز۔ بہرِ پردہ داری آگئی
صد نقاب اوڑھے ہوئے پرہیزگاری آگئی
لیجئے نورِ جہاں کی بھی سواری آگئی
رگ رگ جھرمٹ عقل کا تہذیب کا تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

غنچہ و گل میں مثالِ بُو ہوئے دونوں نہاں
باغ میں داخل ہوا شاہِ جہاں صاحبقراں
سخت گیر و دادگستر قہرماں و مہرباں
ہمرکابِ اقبالِ شاہی شان و شوکت ہمعناں
میرِ ساماں ساتھ اور ساماں بھی تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

محوِ سیرِ باغ ہے یہ صاحبِ توقیر بھی
اب چمن میں گونج اٹھا اک نعرۂ تکبیر بھی
غل ہوا وہ آئے شاہنشاہِ عالمگیر بھی
فقر کے قبضے میں تخت و بخت بھی تسخیر بھی
سامنے قرآن قبضہ ہاتھ میں شمشیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہے عجب دھندلی ضیا اُجلا اندھیرا باغ میں
ہر چمن کو نور پوشوں نے ہے گھیرا باغ میں
ہے شناسا اب کوئی تیرا نہ میرا باغ میں
باغبانِ باغ کا اُترا ہے ڈیرا باغ میں

خوف ہے تعزیر کا اِن کو نہ دار و گیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

تو نے دیکھا اے تصوّر کیا ہے اب پھولوں کا رنگ؟
آبشاروں کا یہ نغمہ۔ نہر کا یہ جلترنگ
ڈل کے اندر نقرئی لہروں کی پریاں محوِ جنگ
چاند تاروں کو زمیں پر لوٹ جانے کی امنگ

بے خودی طاری ہے عالم ہے عجب تاثیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

چاند ڈل میں ڈوبنے کو ہے سحر ہونے کو ہے
روز کا ہنگامہ پھر پیشِ نظر ہونے کو ہے
ہائے یہ منظر بھی اب زیر و زبر ہونے کو ہے
سوئے بالا پاک روحوں کا سفر ہونے کو ہے

اِذن دے اے ہم نشیں اک نالۂ شبگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

باغ کے در پر بسر راتیں کیا کرتا ہوں مَیں
نذرِ خاموشی مناجاتیں کیا کرتا ہوں مَیں
ماضیٔ کشمیر سے باتیں کیا کرتا ہوں مَیں
بادشاہوں سے ملاقاتیں کیا کرتا ہوں مَیں

پوچھتا رہتا ہوں مقصد اُن سے اِس تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہنس کے فرماتے ہیں وہ اے شاعرِ رنگیں بیاں
تو نے دیکھے شوکتِ انسانِ فانی کے نشاں
دیکھنے والا اگر ہو زندگی کا راز داں!
وہ بھی کر سکتا ہے یونہی حُسنِ فطرت کو عیاں!

ہے یہ اِک ادنیٰ نمونہ قوّت و تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

دیکھنے والے مگر اس بات کو سمجھے نہیں
حوصلے والوں کی نفسیّات کو سمجھے نہیں
ان سبق آموز تعمیرات کو سمجھے نہیں
اور کیا سمجھیں گے اپنی ذات کو سمجھے نہیں

توڑ کر ہمت کھلونا بن گئے تقدیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

زندگانی چار دن کی زندگانی ہی سہی
شوکتِ مغلیہ اب قصہ کہانی ہی سہی
اِک سبق دیتی ہیں تعمیریں پُرانی ہی سہی
نقش قائم ہے ہمارا نقشِ فانی ہی سہی
راز تو کھلتا ہے اِس سے عالمِ تغییر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

کیا مجال دم زدن شاہوں کے ارشادات پر
شاہدِ عادل ہے تاریخ ان کے احسانات پر
جو نظر تھی قصر و ایوانات پر باغات پر
کاش وہ مرکوز ہوتی آدمی کی ذات پر
پھر بجا ہوتا گلہ کوتاہیِ تدبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

نسلِ انسانی کو ٹھہرایا گیا ہے کار و زشت
رائگاں ہوتی رہی مزدور کی زرخیز کشت
رنگ و نغمہ ساغر و مل سبزہ و گُل سنگ و خشت
خواب کے عالم کو اہلِ مقدرت سمجھے بہشت

خواب دیکھا منہ نہ دیکھا خواب کی تعبیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اہلِ زر کشمیریوں کے حال پر ہنستے ہیں آج
نام ہے ان کا فریبی حیلہ گر روبہ مزاج
بے دلی۔ بے اعتمادی مفلسی اور احتیاج
بندگی صدہا برس کی اور مسلسل سامراج

کِس قدر ساماں فراہم ہے یہاں تحقیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اہلِ حشمت کی یہ قبریں یہ شکستہ کاخ و کُو
زنگ خوردہ اسلحہ، ٹوٹے ہوئے جام و سبُو
ہڈیاں مزدور کی ہیں اور کسانوں کا لہُو
جس کھنڈر کو دیکھ کر اے دوست افسُردہ ہے تو
یہ خرابہ ہے خدا کی بہترین تعمیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

عشرتِ ماضی کی ہے خمیازہ کش دنیائے حال
عیش چند افراد کا اور جماعت پر وبال
ہائے یہ مغموم مائیں زیست کے غم سے نڈھال
ہائے یہ مدقوق بچے۔ ہائے روٹی کا سوال
ہائے کترا کر نکلنا ان سے ہر رہگیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

ہم وطن ہی جب نہ اپنے ہم وطن کے کام آئے
سر پہ ہمسائے کے ہمسایہ ہی جب طوفاں اٹھائے
کیا بنا سکتی ہے پھر اے دوست تیری ہائے ہائے
یہ مناظر دیکھتا جا اور نہ کر اظہارِ رائے
ورنہ فتویٰ ایک دن لگ جائے گا تکفیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

یہ نظم انگلستان میں لکھی (مئی ۱۹۳۰ء) اور سیسیز ہال
لندن میں ہندوستانی اور فرنگی اجتماع میں سنائی گئی۔

میں نے انگلستان میں ایک دوست سے پوچھا، تم یہاں چودہ پندرہ برس سے مقیم ہو۔ وطن کب چلو گے؟

اُس نے جواب دیا "اپنے وطن میں کیا رکھا ہے ———— !"

میں انگلستان میں تازہ وارد تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ انگلستان کی رنگینیاں اور نغمے مجھے بھی جذب کرتے جا رہے ہیں ———— میرے دل کی گہرائی سے ایک نالۂ جانکاہ ابھرا اور میں نے اُسے ترانے کی شکل دیدی ————

اس دوست کی موجودگی میں اُسی کی طرح اور بہت سے ہندوستان کو ٹھکرانے والے اور بھول جانے والے ہندوستانیوں اور ان کے دل و دماغ پر چھانے والے فرنگیوں کے درمیان میں نے میں نے اپنے دیس کی بیراگنی گائی ———— آنسو تھے اور ہندوستانی ہیبت تھی اور فرنگی ———— اب میں اور میرا دوست اور بہت سے دوسرے ہندوستانی اپنے وطن میں ہیں ————

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

رشکِ عدن ہے   باغِ وطن بھی
گُل بھی ہیں موجود   گُل پیرہن بھی
نازک بدن بھی   غنچہ دہن بھی
لیلیٰ روش بھی   شیریں سخن بھی

کچھ کم نہیں وہ
اُجڑا چمن بھی

اُس کے بھی اک بار   کر لے نظارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اُس حُسن میں ہے ہلکا نمک بھی

مے کا نشہ بھی لطفِ گزک بھی

رنگین کلیاں جن میں مہک بھی

دل میں وفا بھی درد اور تپک بھی

روئے زمیں بھی

چشمِ فلک بھی

سب ہیں بھکاری بھارت کے دوارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

حسن و نظر کی خاموش گھاتیں
عشق و ہوس کی دھومیں براتیں
سب ہیں وہاں بھی یہ واردتیں
دیکھی نہیں کیا تو نے وہ راتیں

دولھا دلھن جب
کرتے ہیں باتیں
ہنستی ہیں کلیاں کھلتے ہیں تارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

مے خانے بھی ہیں　　پیرِ مغاں بھی

ہنگامے بھی ہیں　　خاموشیاں بھی

لُطفِ بہاراں　　خوفِ خزاں بھی

ساگر بھی موجُود　　آبِ رواں بھی

جو کچھ یہاں ہے

سب ہے وہاں بھی

پھرتے ہو بے کار　　کیوں مارے مارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

سودے وہاں بھی کرتے ہیں شہری
چلتے ہیں ہر سُو سِکّے سُنہری
دیہات پر ہے اِک نیند گہری
لہریں وہاں بھی لیتے ہیں لہری

بازار منڈی
تھانہ کچہری

کرتے ہیں دِن رات سب وارے نیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارا

اپنے وطن کے دِن رات نیارے
وہ چاند سُورج نُوری غبارے
وہ ندّیاں ہیں امرت کے دھارے
دُنیا سے اُونچے پربت ہمارے

باغ اَور آکاش
پُھول اَور تارے

سب منتظر ہیں میرے تمہارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارا

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

وہ سیدھی سادی بچّوں کی مائیں
آنچل ہیں جن کے ٹھنڈی ہوائیں
زلفیں ہیں جن کی کالی گھٹائیں
بھولوگے کب تک اُن کی وفائیں
کب تک کروگے
اُن پر جفائیں
چھوڑا ہے اُن کو کس کے سہارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

معصوم معصوم بھولی نگاہیں
دل ڈھونڈتا ہے جن کی پناہیں
کن حسرتوں سے تکتی ہیں راہیں
وہ گرم آنسو وہ سرد آہیں

مانیں نہ مانیں
چاہیں نہ چاہیں

کھینچیں گے اک دن ان کے اشارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں
سب کُچھ ہے پیارے

گردن جھکاؤ تصویر دیکھو
میسُور دیکھو کشمیر دیکھو
خوابِ جہاں کی تعبیر دیکھو
پھرتاج کی بھی تعمیر دیکھو
آنکھوں سے اپنی
تقصیر دیکھو
اپنے خزانے تُم نے بسارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

سب کچھ ہے پیارے اپنے وطن میں
ہے مست زردار مال اور دھن میں
مزدور گویا مُردہ کفن میں
لیکن ہے وہ بھی اپنی لگن میں

پھر گونجتی ہے
گوکل کے بَن میں
لَے بنسری کی جمنا کنارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

ماضی سے بہتر بیشک نہیں حال
علم و ہنر کا پھر بھی نہیں کال
ٹیگور کا ساز جادوئے بنگال
پنجاب کا ناز اعجازِ اقبال

اور یہ مسافر
آوارہ پامال

ہیں قابلِ دید سارے کے سارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

دِل میں اگر ہے کوئی حسینہ
کر لے اُسے بھی تعویذِ سینہ
لے چل وطن میں اپنا خزینہ
ہو زیبِ خاتم یہ بھی نگینہ

ساحل پہ پہنچے
جس دم سفینہ
تو اپنے منہ سے خود ہی پکارے

اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

نیرنگِ فرنگ

ستمبر ۳۸ء لندن کے ایک جلسہ میں سنائی گئی جو مصنف کو الوداع کہنے کے لئے قبلہ سر عبد القادر کی صدارت میں منعقد ہوا

"اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے" سنائی گئی تو بہت سے انگریز مرد و زن موجود تھے۔ شیخ سر عبدالقادر صاحب نے نظم کا ترجمہ فرمایا۔ ایک صاحب جو بہت معمر تھے اور ہندوستان میں بہت بڑے عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ فرمانے لگے شاعر خود بھی "ہوم سکنس" میں مبتلا ہے اور دوسرے ہندوستانی سیاحوں کو بھی بیمار کر رہا ہے۔

یہ کہہ کر ہنسے اور مجھ سے فرمائش کی کہ یورپ کی سیر کے بعد جب وطن جانے لگو تو اس وقت کے تاثرات بھی سناتے جانا" —————— مجھے فرمائش یاد رہی۔ الوداعی جلسہ ہوا تو میں نے یہ نظم سنائی۔ وہ صاحب بھی موجود تھے بولے۔ مجھے توقع نہ تھی کہ انگلستان کو ایک ہندوستانی اُن کے گھر میں آکر آئینہ دکھائے گا —————— یہ تاریخ میں پہلا واقعہ ہے"۔

نیرنگِ فرنگ

نیرنگِ طلسمات ہے افرنگ کی دُنیا
قسمت نے دکھائی یہ نئے رنگ کی دُنیا
رقص و طرب و نغمہ و آہنگ کی دُنیا
ہنگامہ و ہول و فتن و جنگ کی دُنیا

فردوس بھی ہے خوف سے خالی بھی نہیں ہے
اصلی جو نہیں ہے تو خیالی بھی نہیں ہے

رنگینیٔ گل - بارِ ثمر دیکھ رہا ہوں
حسنِ عمل و حسنِ نظر دیکھ رہا ہوں
ہر سمت فراوانیٔ زر دیکھ رہا ہوں
سرمایہ و محنت کا اثر دیکھ رہا ہوں

اِس عقل نے ہمت سے بڑا کام لیا ہے
تکلیف اُٹھائی ہے تو آرام لیا ہے

حیراں ہوں سرِ راہ گذر دیکھ رہا ہوں
اِک حشر سا تا حدِّ نظر دیکھ رہا ہوں
ہنگامۂ انبوہِ بشر دیکھ رہا ہوں
ہر فرد کو بے خوف خطر دیکھ رہا ہوں

اِس بِھیڑ میں ٹکرا کے گذرتا نہیں کوئی
افلاس کی توہین بھی کرتا نہیں کوئی

آفاق پُر از فتنہ و شر دیکھ رہا ہُوں
یہ روز و شب و شام و سحر دیکھ رہا ہُوں
قوموں کی ہلاکت کا ہنر دیکھ رہا ہُوں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہُوں

جو دیکھ رہا ہُوں وہ بیاں ہو نہیں سکتا
آنکھوں سے مری کارِ زباں ہو نہیں سکتا

مٹّی ہی نہیں آگ بھی پانی بھی ہَوا بھی
مغلوبِ نظر آتے ہیں زنجیر بپا بھی
اِک زلزلہ ہے زیرِ زمیں زیرِ سما بھی
حیران فرشتے بھی ہیں شاہد ہے خدا بھی

دیوار شکستہ ہوئی زندانِ بقا کی
اِنسان کے پنجے میں ہے تقدیر فنا کی

شاعر ہُوں مِرا کام نہیں فلسفہ رانی
کھلتی ہے مجھے ٹھوس نتائج کی گرانی
انسان کی تصویر نئی ہو کہ پرانی
مطلوب مجھے حسن ہے اور حُسنِ معانی

اللہ کے بندوں سے مجھے بیر نہیں ہے
یعنی مری دنیا میں کوئی غیر نہیں ہے

مغرب میں جمایا ہے جو خورشید نے ڈیرا
لازم ہے کہ چندے رہے مشرق میں اندھیرا
جب رات گذر جائیگی آئے گا سویرا
ایّام پہ کچھ زور نہ تیرا ہے نہ میرا

یہ دَورِ شب و روز و مہ و سال رہے گا
گردش ہے جو قائم تو یہی حال رہے گا

مشرق بھی نہیں علم و کمالات سے خالی
مشرق ہی کے در پہ کبھی مغرب تھا سوالی
ہاں ایک ادا دیکھی ہے مغرب میں نرالی
مجبور ہے مشرق کی جہاں ہمّتِ عالی
یہ ایک ادا ناز ہے عورت کی لقا پہ
مشرق مرا قرباں ہے اِسی ایک ادا پہ

یہ فلسفہ یہ عِلم یہ حکمت یہ کمالات
یہ فکر یہ تدبیر یہ اعمال و خیالات
یہ بحث یہ تحقیق۔ جوابات۔ سوالات
یہ گولہ یہ بارود۔ ہلاکت کے یہ آلات
ہر صبح۔ جلال و غضب و طیش کی صورت
ہر شام۔ جمال و طرب و عیش کی صورت

یہ قول و عمل ۔ ولولہ و عقل و فراست
یہ ضبط یہ نظم اور یہ تدبُّر یہ سیاست
یہ شان یہ شوکت یہ تکلف یہ نفاست
حاوی ہے ہر اِک بات پہ اک حرفِ ریاست
اِس حرف میں ہر کام کی تحریک نہاں ہے
پھر اس میں بھی اِک نکتۂ باریک نہاں ہے
یہ نکتۂ باریک ہے بیشک سبق آموز
عریاں ہے اس آئینہ میں اِک شکلِ دل افروز
مقصودِ ریاست کا ہے روشن صفتِ روز
اِس ابر میں خنداں ہے عجب برقِ جہاں سوز
یہ برقِ جہاں سوز ہے حُسنِ زنِ مغرب
حُسنِ زنِ مغرب ہی سے ہے خرمنِ مغرب

بازار میں ہے گرمیٔ بازار اِسی سے
آتے ہیں دکانوں میں خریدار اِسی سے
سودا ہے یہی چلتا ہے بیوپار اِسی سے
جیبوں میں ہے اشرفیوں کی جھنکار اِسی سے

ہر کوچہ و برزن میں ہے تشہیر اِسی کی
دیکھی در و دیوار پہ تصویر اِسی کی

میخانوں میں ہے رنگِ مے و جام اِسی کا
کس کا ہے لہُو بادۂ گلفام اِسی کا
تصویر کے پردے پہ بھی ہے کام اِسی کا
اخبار کے صفحوں میں بھی ہے نام اِسی کا

اور سازِ سیاست کی بھی دمساز یہی ہے
ظاہر کبھی ہوتا نہیں جو راز یہی ہے

کہتے ہیں ترقی کی ہے بنیاد اِسی پر
ایجاد ہے یہ عالمِ ایجاد اِسی پر
ظاہر میں تو افرنگ ہے آباد اِسی پر
باطن کو جو دیکھو تو ہے بیداد اِسی پر

عورت کو جوانی میں بناتے ہیں تماشا
ڈھل جائے جوانی تو سمجھ لیتے ہیں لاشا

مشرق میں جو زینت ہے چھپانے کے لیے ہے
مغرب میں مگر جلوہ دکھانے کے لیے ہے
مشرق میں تو زن گھر ہی بسانے کے لیے ہے
مغرب میں یہ بیچاری کمانے کے لیے ہے

آزاد — ! عیشت کے سرانجام کی خاطر
مجبور ہے معصوم — ! ہر اک کام کی خاطر

تشریح بدن کرتی ہیں لندن کی دکانیں
ہیرے کے یہ جلوے ہیں یہ بلّور کی شانیں
پلکیں ہیں یہ تیر۔ اور یہ ابرو ہیں کمانیں
آئینوں میں آئینہ ہیں جوبن اُٹھانیں

یہ جلوہ مذمت نہ ستائش کے لیے ہے
بیوپار کی خاطر ہے نمائش کے لیے ہے

بے جان نمونوں میں جو یہ رنگِ ادا ہے
جاندار حسینوں کا تو پھر ذکر ہی کیا ہے
جس بُت پہ نظر ڈالئے اک شانِ خدا ہے
یہ شانِ خدا ہے تو بہت ہوش رہا ہے

اللہ۔ جو یہ جلوہ نمائی ہے بتوں کی
تیری ہے خدائی ؟ کہ خدائی ہے بتوں کی

پیرس میں یہ انوار ہیں لندن سے زیادہ
وہ حسن ہے رنگین۔ یہاں حسن ہے سادہ
وہ رقص برہنہ۔ وہ اچھل کود۔ وہ بادہ
ہر جوشش نمائش میں نہاں ایک ارادہ
یعنی کوئی ترکیب کوئی چال نکالو
جیبوں سے مسافر کی زر و مال نکالو

مہلک ہیں یہ سب رہگذر و کوچہ و بازار
ہر گام پہ صد فتنۂ محشر ہے نمودار
ایمان تو کیا جان کا بچنا بھی ہے دشوار
آنکھوں سے بھی ہشیار ہو دل سے بھی خبردار
اے دوست خطرناک ہے اُفتاد نظر کی
پھسلا جو قدم خیر نہیں کاسۂ سر کی

اِس حُسن کے انبوہِ قیامت کو تو دیکھو
اِس نازو ادا و قد و قامت کو تو دیکھو
مَیں دیکھ رہا ہوں مری شامت کو تو دیکھو
نادار مسافر کی ندامت کو تو دیکھو

خفّت وہ ملی ہے۔ کہ اُٹھائی نہیں جاتی
دل خاک ملے۔ آنکھ ملائی نہیں جاتی

دیکھی ہے عجب سیر سمندر کے کنارے
نِکھرے رہ ریت کے ذرّے فلکِ حُسن کے تارے
وہ رنگ وہ نغمہ وہ شرارت وہ اشارے
شمشیرِ برہنہ کے نظر سوز نظارے

پانی میں تھرکتی ہوئی سیماب کی موجیں
اور دھوپ میں خورشیدِ جہانتاب کی موجیں

جل پریوں میں رقصاں تھے یہاں مردمِ آبی
مستی وہ فضا میں تھی کہ منظر تھا گلابی
صوفی تھے وہ سب ایک فقط میں تھا شرابی
چاہی مری آنکھوں نے مرے دل کی خرابی

ساحل نہیں میرے لئے گرداب بلا تھا
اللہ نے بچایا مجھے میں ڈوب چلا تھا

اللہ رے ملبوسِ حسینانِ طرحدار
عریاں بھی ہے مستور بھی ہر سادہ پرکار
خلوت کدۂ حُسن و محبّت ہیں چمن زار
بیٹھے ہوئے لیٹے ہوئے خوابیدہ و بیدار

گُل آپ ہی سرمستِ ہوا جھوم رہے ہیں
غنچے نگہِ اہلِ رضا چوم رہے ہیں

ڈھونڈے سے بھی ملتی نہیں آنکھوں کو پناہیں
لڑتی ہیں سرِ راہ نگاہوں سے نگاہیں
لیکن یہ تعجب ہے کہ اٹھتی نہیں آہیں
چڑھتے ہیں نشے زیبِ کمر ہوتی ہیں باہیں

اِس جوشِ ملاقات میں حائل نہیں کوئی
فرسودہ خیالات کا قائل نہیں کوئی

کمزور دلائل کی پناہوں میں جوانی
بے باک ہوسناک نگاہوں میں جوانی
اٹھلائی ہوئی پھرتی ہے راہوں میں جوانی
مشغول ہے معصوم گناہوں میں جوانی

بجلی کی چمک خندۂ گفتار سے پیدا
شعلے کی لپک گرمیٔ رفتار سے پیدا

قانونِ جہاں بر سرِ بیداد نہ آئے
کیوں وصل سے ہر اہلِ ہوس شاد نہ آئے
خود حُسن پہ جب تک کوئی افتاد نہ آئے
کوشش یہی ہوتی ہے خدا یاد نہ آئے

مادر پدر آزاد سے کیا کام خُدا کا
مجبور ہی لیتے ہیں فقط نام خُدا کا

افرنگ میں در اصل حسینوں کی ہے شاہی
قبضے میں انہی کے ہے سفیدی و سیاہی
ہوتی ہے انہی کے لیے اوروں کی تباہی
فوجیں اسی خاطر اسی خاطر ہیں سپاہی

توپوں سے جو ہوتی ہے یہ اقوام کی خاطر
اے حُسن یہ ہے سب ترے آرام کی خاطر

خوش ہو مرے مشرق تری قسمت ہی نرالی
مغرب کے لبوں پر ہے ترے خون کی لالی
کالا ہے یہ چہرہ۔ مری ہڈی نہیں کالی
پس کر بھی مری خاک نہیں جھینپنے والی

یہ باغ ہے میرے ہی لہو سے تر و تازہ
ہے راکھ مری ہی رُخ افرنگ کا غازہ

اب میرا سلام اے مرے ارباب عنایات
جاتا ہوں کہ مطلوب وطن ہیں مری خدمات
رُکنے کی اجازت نہیں دیتے مرے حالات
اور یاد بھی ہیں شیخ طریقت کی ہدایات

شاعر کے لیے دور کا دیدار ہی بس ہے
نظارہ بڑی بات ہے باقی تو ہوس ہے

صحت کی خرابی نے بھی کچھ بات نباہی
کچھ قلّتِ زر سے بھی کوئی چیز نہ چاہی
ماتم میں جوانی کے یہ گذری ہے چھ ماہی
اِس پر بھی گنہگار ہوں توبہ ہے الٰہی!
یہ دیدہ و دل تیرا کرم تیری عطا ہے
پھر بھی نہیں تسکیں مجھے، میری ہی خطا ہے

میرا کلام بہتریں

ریڈیو والوں کی فرمائش پر ریڈیو کے مشاعرے میں پڑھی

تاثیر نے اپنے وقت کے مصنفوں کو تلقین کی

چکی پیسو روٹی کھاؤ

مصنفوں نے یہ مصرعہ ایک ناشر کتب کو سنایا وہ ناک بھوں چڑھا کر بولا یہ پرانی شاعری ہے۔ ہم کہتے تو یوں کہتے

چکی پیسو آٹا گوندھو نان پکاؤ
اپنے قلب و جگر کو بھونو
ان سے دسترخوان سجاؤ
بازاری ناشر کو کھلاؤ
خود بھوکے مرجاؤ ——

سنا ہے اس پر بڑی واہ واہ ہوئی۔ خود مصنف بول اُٹھے

ہاں یہ ہے اصلی شاعری

میرا کلامِ بہتریں

آج کل میرے کلامِ بہتریں کی ہے تلاش

آپ بیتی آپ کو اپنی سُنا سکتا ہُوں کاش

اک طرف فکرِ سخن تھی اک طرف فکرِ معاش

اِس تصادم سے ہوا تھا شیشۂ دل پاش پاش

عرش پر گونجی تھی اُس دم ایک آوازِ حزیں

تھی یہ آوازِ حزیں

میرا کلامِ بہتریں

(۲)

مدتوں جنسِ سخن کے بیچنے پر تھا مدار
میری مزدوری چکاتے تھے مرے سرمایہ دار
کوڑیوں میں رولتے تھے جب وہ موتی بار بار
دید کے قابل ہوا کرتے تھے میرے شاہکار
خندہ آتا تھا مرے لب پر۔ مگر اندوہگیں
خندۂ اندوہگیں
میرا کلام بہتریں

(۳۰)

شعر کا دامن گزدل سے ناپتے تھے بے شعور

پھر سیاہی بن کے ڈھلتا تھا مری آنکھوں کا نور

بعد ازاں ہوتی تھی میری حاضری ان کے حضور

سرد مہری دیکھتی تھی گرمیِ چشمِ غیور

پانی پانی ہو کے بہ جاتی تھی آہِ آتشیں

میری آہِ آتشیں

میرا کلام بہتریں

(۴۲)

میرے دم سے جن دنوں روشن تھی ہر بزمِ سخن
شمع کہہ کہہ کر جلاتی تھی مجھے ہر انجمن

میرِ محفل بولتے تھے ہم صفیرانِ چمن
اور سرِ بازار کرتے تھے نمودِ ما و من

تھا مرے نخلِ ہنر سے خرمنِ ہر خوشہ چیں

خرمنِ ہر خوشہ چیں

میرا کلام بہتریں

(۵)

اِس نرالی گرمِ بازاری سے مَیں تنگ آگیا
عارضِ عرضِ سخن پر اِک نیا رنگ آگیا
میرے ہاتھ اِک اَور ساز اِک اَور آہنگ آگیا
کچھ نہ کہنے سُنتے رہنے کا مجھے ڈھنگ آگیا
اب اُڑائی جا نہیں سکتی یہ طرزِ دل نشیں
ہے یہ طرزِ دل نشیں
میرا کلام بہتریں

(۶)

خامشی میرے سخن کا اک نیا انداز ہے

اس نئے انداز پر عرضِ سخن کو ناز ہے

ہاں یہی نیرنگ ہے جو سربسر اعجاز ہے

ہاں یہی آہنگ ہے جو بے نیازِ ساز ہے

صورتِ بے حرف ہے اور معنیٔ وجد آفریں

معنیٔ وجد آفریں

میرا کلام بہتریں

(۷)

اب چراغ اپنا نہ داماں جلا لیتا ہوں میں
جب کبھی تنہائی سے محفل جما لیتا ہوں میں
نغمۂ دل دل ہی دل میں گنگنا لیتا ہوں میں
دل ہی دل میں رقص کر لیتا ہوں گا لیتا ہوں میں

یہ کلامِ بہترین اب لب تک آتا ہی نہیں
لب تک آتا ہی نہیں
میرا کلامِ بہترین

(۸)

ہر ستارا اکملیّت میں ہے آپ اپنی مثال
ہر گُلِ رنگیں سجائے خود ہے دنیائے کمال

اے کہ تیرے لب پہ ہے "قدرِ افادی" کا سوال
دیکھ میرے آنسوؤں کا رنگ داغوں کا جمال

ہے کلامِ بہترین میرا نمایاں ہر کہیں
ہے نمایاں ہر کہیں
میرا کلامِ بہترین

جھوٹا سنسار

سچّی بسنت

جھوٹا سنسار سنہ ۱۹۳۵ء میں لکھنا آغاز کیا اور سنہ ۱۹۴۱ء میں مکمل ہوا

سچی بسنت سنہ ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی۔

جھوٹا سب سنسار:- اپنے وطن میں سیاسی مجلسی، مذہبی وغیرہ تحریکات کے علمبرداروں اور رہنماؤں نے مجھے اور شاید اوروں کو بھی جس منزل پر پہنچایا ہے۔ اس گیت میں دبی زبان سے اس کا اظہار ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں اس گیت کے دو بند لکھے گئے تھے۔ اس خیال سے کہ شاید میرے اخذ کردہ نتائج غلط ہوں سنہ ۱۹۴۱ء تک اپنی رائے کا جائزہ لیتا رہا۔ تبدیلی کی کوئی وجہ نظر نہ آئی بلکہ دو بند اور بڑھ گئے۔

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

موہ کا دریا لوبھ کی نیّا

کامی کھیون ہار

موج کے بل پر چل نکلے تھے

آن پھنسے منجدھار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

(۲)

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

تن کے اُجلے من کے میلے

دَھن کی دُھن اسوار

اُوپر اُوپر راہ بتائیں

اندر سے بٹ مار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

(۳۱)

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

چولے دھاریں دین دھرم کے

نکلیں چور چکار

ان چولوں کی آڑ میں چمکے

دو دھاری تروار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

(۴۸)

جھوٹا سب سنسار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

گیان دھیان کے پتّر باچیں

بیچیں سُرگ ادھار

گیانی پاتر بن کر ناچیں

نقد کریں بیوپار

پیارے

جھوٹا سب سنسار

سچی بسنت

بسنت کی رُت آ گئی تیرے وطن پہ چھا گئی

ہوا کا رُخ پلٹ گیا

خزاں کا زور گھٹ گیا

الم کا ابر چھٹ گیا

پہن کے جامہ نمو چمن ہرا بھرا ہُوا

کوئی نہیں بس ایک تو ہے آج بھی مرا ہُوا

بسنت کی رُت آ گئی

تیرے وطن پہ چھا گئی

(۲)

بسنت کی رُت آگئی　　ترے وطن پہ چھا گئی

بگاڑ کو سنوار کے

دلوں کا مَیل اتار کے

دن آگئے بہار کے

اُتار دے اُتار دے　　یہ خول تو بھی ہوش کا

طرب کدہ سنوار دے　　جنونِ گرم جوش کا

بسنت کی رُت آگئی

ترے وطن پہ چھا گئی

(۳۰)

بسنت کی رُت آگئی
ترے وطن پہ چھا گئی

مٹا دے اب کدُورتیں
کہ نیک ہیں مہُورتیں
گلوں کی دیکھ صُورتیں

اُمید کی مہک تو ہے
یہ پھُول زرد ہی سہی
نوید کی لہک تو ہے
ہوائیں سرد ہی سہی
بسنت کی رُت آگئی
ترے وطن پہ چھا گئی

(۴۴)

بسنت کی رت آ گئی   ترے وطن پہ چھا گئی

جو تو وفا سرشت ہو

تو سبزہ و یہ کشت ہو

یہی چمن بہشت ہو

یہ زرد رنگ خوب ہے   مگر جنوں کا رنگ ہے

پھر اس سے بڑھ کے خوب شے   ترے ہی خوں کا رنگ ہے

بسنت کی رت آ گئی

ترے وطن پہ چھا گئی

تیری منزل دُور

۳۱ء

فلسفہ نہیں مشاہدہ ہے۔ آسان لفظوں اور سیدھی سادی دُھن کے باوجود اگر مشاہدہ فلسفے کی صورت اختیار کر لے تو "ما مقیمانِ کوئے دلدار یم" کا ورد کرنے والوں کی شکایت بجا ہے۔ لیکن اس کو میرے عجزِ بیان پر بھی تو محمول کیا جا سکتا ہے۔

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

نظّارے اِس آب و گل کے

رہزن ہیں تیری منزل کے

نغمہ ہو یا رنگِ گل ہو

سب پردے ہیں نگاہ و دل کے

تو ہے طالبِ نور

مسافر

تیری منزل دور

(۲)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

لیلےٰ کے محمل سے نکل جا

شیریں کی محفل سے نکل جا

حُسن و ادا دونوں کے در پر

دل رو کے تو دل سے نکل جا

دِل سے نہ ہو مجبُور

مسافر

تیری منزل دُور

(۳۱)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

کوہ و بیاباں جن کا ٹھکانا

اُن کی راہ نہ ہرگز جانا

ہمّت سے اور فکر سے عاری

قیس بچارا اِک دیوانہ

کوہکن اِک مزدور

مسافر

تیری منزل دور

(۴۴)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

دنیا کے بازاری دھندے

زر کے گنگا جمنی پھندے

کیا اندھی ہے دُنیا جس پر

اندھے ہیں دنیا کے بندے

عاجز۔ اور مغرور

مسافر

تیری منزل دُور

(۵)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

جس میں نہ ہو چلنے کا یارا

وہ کر لے جنت کو گوارا

شیخ کو لینے دے یہ سہارا

یہ بے چارہ ضعف کا مارا

حُور سے ہے مسحور

مسافر

تیری منزل دُور

(۶)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

جس منزل کی تجھ کو لگن ہے

اُس منزل کی راہ کٹھن ہے

اُس منزل تک عشق ہی جائے

عقل بچاری خستہ تن ہے

فکر وہاں معذور

مسافر

تیری منزل دُور

(۷)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

راہ میں حائل کوہِ سینا

جس کی چوٹی پہلا زینہ

دل آئینہ ہے تو تجھ پر

جھلکیں گے انوارِ مدینہ

تجلیوں میں مستور

مسافر

تیری منزل دُور

(۸)

تیری منزل دُور
مسافر
تیری منزل دُور
اور بڑھیں تو قیامت ٹوٹے
روشنیوں کا چشمہ پھوٹے
موسےٰ نے پہلے ہی قدم پر
غش کھایا اور رستے چھوٹے
جل کر رہ گیا طور
مسافر
تیری منزل دور

(۹)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

جو در پر مطلوب کے جائے

درشن کو محبوب کے جائے

تیر کے نکلے صحرا صحرا

دریا دریا ڈوب کے جائے

اُلٹا سب دستور

مسافر

تیری منزل دُور

(۱۰)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

بعض تو بے خود ہو جاتے ہیں

بعض خودی میں کھو جاتے ہیں

رہ جاتے ہیں سر کٹوا کر

دار پہ چڑھ کر سو جاتے ہیں

سرمد اور منصور

مسافر

تیری منزل دُور

(۱۱)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

خضرِ رفیقِ راہ نہیں ہے

منزل سے آگاہ نہیں ہے

اِس رستے میں سنگی ساتھی

کوئی بجز اللہ نہیں ہے

وہ بھی تحت شعور

مسافر

تیری منزل دُور

(۱۲)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

خانقھوں میں درسِ فقیری

چلّہ کشی اور گوشہ گیری

راحت کے حجروں سے نکل کر

دامِ آزادی کی اسیری

کون کرے منظور

مسافر

تیری منزل دُور

(۱۳)

تیری منزل دُور

مسافر

تیری منزل دُور

دیوانہ فرزانہ جانے

فرزانہ دیوانہ جانے

کوئی تیری بات نہ سمجھے

ہر کوئی بیگانہ جانے

کوئی نہ ہو مسرور

مسافر

تیری منزل دُور

(۱۴)

تیری منزل دور

مسافر

تیری منزل دور

شمع مثال پگھلتے جانا

پروانہ سال جلتے جانا

جلنا اور پگھلنا۔ لیکن

چلنا، چلنا۔ چلتے جانا

کس کا ہے مقدور

مسافر

تیری منزل دور

بنجارہ پربت

۱۹۳۷ء

سیّد محمّد مہدی اور سیّد ہاشم علیخاں

کے نام

یہ نظم معنون کرتا ہُوں۔ اس لئے کہ اوّل الذکر نے حیدرآباد کے قریب "بنجارہ پربت" کی سنگلاخ بلندی پر (میرے دیکھتے دیکھتے) ایک فردوس بہ رُوئے زمین تعمیر کر دیا۔ اور ثانی الذکر نے مجھ گنہگار کو (جیتے جی) اس فردوس میں داخل ہونے اور سیر کر کے زندہ نکل جانے کی اجازت دی۔

بنجارہ پربت

دو جانب تا حدِّ نظر، پھیلے ہُوئے بن کے نظارے

کوہ و دمن کے سنگ و شجر کے دشت و چمن کے نظارے

اور دو جانب حُور و قصُور و خُلد و عدن کے نظارے

یہ بنجارہ پربت۔ یہ فردوسِ دکن کے نظارے

جنّت میں بھی کون کرے گا ان سے زیادہ شاد مجھے

جنّت میں کب ٹکنے دے گی اِس دُنیا کی یاد مجھے

(۲)

مَیں نے اس ویرانے کو بستی میں بدلتے دیکھا ہے

پتّھر حُسنِ صُورت کے سانچے میں ڈھلتے دیکھا ہے

رنگ رنگ کی صنعت کا نیرنگ اُچھلتے دیکھا ہے

سنگ سنگ پر شاخ و شجر کو پُھولتے پھلتے دیکھا ہے

اب تک ہے یہ دیس کی دُنیا عیدِ مبارک باد مجھے

جنّت میں کب ٹکنے دے گی اِس دنیا کی یاد مجھے

(۳)

پربت کی دیوزاد چٹانیں بنیادیں تعمیروں کی
قدرت جرأت دیکھ رہی ہے انسانی تدبیروں کی
صنعت منہ سے بول رہی ہے حاجت کیا تقریروں کی
خاموشی سے دیکھتے جاؤ دنیا ہے تصویروں کی
یہ مزدور نظر آتے ہیں مانی اور بہزاد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

(۴)

یاد مجھے تڑپائے گی اِن باہمت انسانوں کی

جن کے حُسنِ عمل سے بدلی ماہیت ویرانوں کی

جن کے قدم کی ٹھوکر سے جاگی تقدیر چٹانوں کی

جن کے ہاتھوں پتّھر ٹُوٹے شکل بنی ایوانوں کی

اِن کی ندرت کاری پر دینا ہے خراجِ داد مُجھے

جنّت میں کب ٹِکنے دے گی اس دنیا کی یاد مُجھے

(۵)

کوہکن و شیریں کا قصّہ، ناکامی کا افسانہ
معمُولی سی نہر کی خاطر یُوں سر پھوڑ کے مر جانا
دُوسروں کا منظورِ نظر فرہاد سا جاہل دیوانہ
اور مِرا موضوعِ سخن اِک عالی ہمّت فرزانہ

مَیں ہُوں مجنوں مہدی کا مطلُوب نہیں فرہاد مُجھے
جنّت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مُجھے

(۶)

صبح کمندیں پھینکتی ہے جب پست و بلند ہستی پر

پہلی کرنیں سورج کی لہراتی ہیں اس بستی پر

اس بستی کے حسن کا پرتو پڑتا ہے ہر ہستی پر

لاکھوں مندر کھل جاتے ہیں چشمِ حسن پرستی پر

سجدوں پر اُکساتی ہے ہر صبح نئی افتاد مجھے

جنّت میں کب ٹکنے دے گی، اس دنیا کی یاد مجھے

(۷)

اِس دُنیا میں ذوقِ نظر پروانہ ہے آزادی کا
آزادی سے کرتا ہوں نظّارہ اِس آبادی کا
پس منظر کہسارِ مُسلسل، سامنے منظر وادی کا
شاید باغِ خاص یہی ہے فطرت کی شہزادی کا
جس میں نظر آتا ہے نہ گلچیں اور نہ کوئی صیّاد مُجھے
جنّت میں کب ٹکنے دے گی، اِس دُنیا کی یاد مُجھے

(۸)

مست ہوائیں پھولوں پر شبنم کے موتی رولتی ہیں
شاخوں کے آغوش میں ننّھی کلیاں آنکھیں کھولتی ہیں
بلبل گُل پر منڈلاتی ہے، پیڑ پہ چڑیاں بولتی ہیں
میرے دل میں توبہ کی کمزور بنائیں ڈولتی ہیں
یاد آتے ہیں گشتِ مصلّے، آبِ رُکنا باد مُجھے
جنّت میں کب ٹکنے دے گی اِس دُنیا کی یاد مُجھے

(۹)

زیرِ چرخِ نیلی ساگر گہرے نیلے پانی کا
آنکھیں ہیں اور لطفِ تماشا لہروں کی جولانی کا
پہلی سی وہ کشتیٔ دل ہے، اور نہ جوش جوانی کا
موجِ ہوائے سیر میں لیکن عالم ہے طُغیانی کا
نغموں کا اِک طُوفاں ہے آہنگِ آب و باد مجھے
جنّت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

(۱۰)

کرنیں دن بھر اس ساگر پر نور کا مینہ برساتی ہیں
اور ہوائیں آبِ رواں پر نقش نگار بناتی ہیں
موجیں موج زنی کرتی ہیں اور لہریں لہراتی ہیں
نقرئی پریاں کھیلتی ہیں، لڑتی ہیں پھر مل جاتی ہیں
ظالم قہقہے مارتی ہیں کہہ کہہ کر آدم زاد مُجھے
جنّت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مُجھے

(۱۱)

مغرب میں ہر شام یہاں ساقی کا دریچہ کھلتا ہے
رنگِ شفق سیلاب کی صورت بامِ فلک سے ڈھلتا ہے
نیلم کے ہر ساگر میں یاقوت کا جوہر گھلتا ہے
کس کو خبر یہ خونابہ کس شئے سے بلتا جلتا ہے

ہائے یہی نشئے ہے یہی شئے ہے جس نے کیا برباد مجھے
جنت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

(۱۲)

دن کا مسافر کرتا ہے جب فکر آسُودہ ہونے کی

پچھم میں ہوتی ہے نمائش اِک رنگین بچھونے کی

سُورج دیوتا ٹھانتے ہیں زرّین محل میں سونے کی

سُوجھتی ہے دہقانِ فلک کو کھیت میں موتی بونے کی

محوِ حیرت کرتا ہے یہ مالِ لاتعداد مُجھے

جنّت میں کب ٹکنے دے گی اس دُنیا کی یاد مُجھے

(۱۳)

جس دم نیند کی ماتی دنیا بستر پر جا سوتی ہے

قمقمہ ہائے برق سے برپا بزمِ چراغاں ہوتی ہے

پریم کی دیوی جل مندر میں چندرہار پروتی ہے

پریم کی آنکھیں جل مندر ہیں پریم کا آنسو موتی ہے

ہر موتی کی جوت یہ دیوی کہتی ہے دھنیا وِ مجھے

جنّت میں کب ٹکنے دے گی اِس دُنیا کی یاد مجھے

(۱۴)

پینٹھ میں جیسے بنج بجریا سب بنجارے کرتے ہیں

بات بات میں گھات بگر ہنس ہنس کے اشارے کرتے ہیں

ایسی ہی کچھ جلوہ فروشی چاند ستارے کرتے ہیں

رات رات میں لاکھوں ہی کے وارے نیارے کرتے ہیں

کیا کیا سیر دکھاتی ہے یہ دنیائے شب زاد مجھے

جنّت میں کب ٹکنے دے گی اس دنیا کی یاد مجھے

(۱۵)

ہاں یہ میرے شام و سحر ہیں، یہ دن ہیں یہ راتیں ہیں

میں ہوں اور مری آنکھوں کی عیدیں ہیں شبراتیں ہیں

چاند ہے سورج ہے ساگر ہے بادل ہے برساتیں ہیں

تنہائی ہے خاموشی ہے دل کی دل سے باتیں ہیں

حاصل ہے اِس دنیا میں تخیلِ سخن ایجاد مجھے

جنت میں کب ٹکنے دے گی اِس دنیا کی یاد مجھے

"بزیرِ شاخِ گل"

اطہر اور احسن سے

مدام سیرِ گلستاں رہے ترا معمول
قدم قدم پہ نچھاور بہارِ عیش کے پھول
گلوں کے سائے میں ہیں بلبلوں کے مدفن بھی
کسی چمن سے بھی گذرے، دعائے خیر نہ بھول

فریبِ آزادی

جھوٹی بسنت

گونجے ہوئے نغموں کی گونج

پہلی دونوں نظمیں سنہ ۱۹۴۷ء میں لکھی گئیں۔ گونجے ہوئے نغموں کی گونج سنہ ۱۹۴۸ء میں لکھی گئی تھی۔

ان نظموں کی شانِ نزول بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ البتہ "فریبِ آزادی" کی جو صورتِ کتابت پیشِ نظر ہے۔ یہ ایک دوست کی فرمائش کا نتیجہ ہے۔ دوست نے (جو شاعر بھی ہیں اور اس حلقہ میں بھی مانے جاتے ہیں جو "ترقی پسند" کہلاتا ہے) بہ اصرار فرمایا معناً نہ سہی صورت ہی کے لحاظ سے کسی نہ کسی نظم کی کتابت ایسی ہونی چاہیے جس کے مصرعے توڑ کر لکھے گئے ہوں۔ اور پڑھنے والے کی پہلی نظر ان کو بے وزن محسوس کرے میں نے اپنے دوست کی خواہش اپنے کاتب صاحب سے بیان کی۔ معلوم ہوتا ہے میں اور میرا کاتب دونوں اس خصوص میں "ہموزن" ہیں۔ ان سے بھی توڑ پھوڑ بن نہیں آئی۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ محض کتابت کی وجہ سے جدید حلقۂ اہلِ کمال تو اپنے میں شامل نہ کرے گا۔ البتہ "رجعت پسند" ضرور ٹکسال باہر کر دیں گے

فریبِ آزادی

شیروں کو آزادی ہے
آزادی کے پابند رہیں
جس کو چاہیں چیریں پھاڑیں
کھائیں پئیں آنند رہیں

سانپوں کو آزادی ہے
ہر بستے گھر میں بسنے کی
اِن کے سر میں زہر بھی ہے
اور عادت بھی ہے ڈسنے کی

شاہیں کو آزادی ہے
آزادی سے پرواز کرے
ننھی منّی چڑیوں پر
جب چاہے مشقِ ناز کرے

پانی میں آزادی ہے
گھڑیالوں اور نہنگوں کو
جیسے چاہیں پالیں پوسیں
اپنی تُند اُمنگوں کو

انساں نے بھی شوخی سیکھی
وحشت کے اِن رنگوں سے
شیر دل سانپوں شاہینوں گھڑیالوں اور نہنگوں سے

انساں بھی کچھ شیر ہیں
باقی بھیڑوں کی آبادی ہے
بھیڑیں سب پابند ہیں
لیکن شیروں کو آزادی ہے

شیر کے آگے بھیڑیں کیا ہیں
اک من بھاتا کھاجا ہے
باقی ساری دنیا پرجا
شیر اکیلا راجا ہے

بھیڑیں لاتعداد ہیں لیکن سب کو جان کے لالے ہیں
ان کو یہ تعلیم ملی ہے
بھیڑیے طاقت والے ہیں

ماس بھی کھائیں کھال بھی نوچیں
ہر دم لاگو جانوں کے
بھیڑیں کاٹیں دَورِ غلامی
بل پر گلّہ بانوں کے

شیر ہیں دعویدار کہ ہم سے امن ہے اِس آبادی کا
بھیڑیں جب تک شیر نہ بن لیں نام نہ لیں آزادی کا

انسانوں میں سانپ بہت ہیں
قاتل بھی زہریلے بھی
ان سے بچنا مشکل ہے
آزاد بھی ہیں پُھرتیلے بھی

سانپ تو بننا مشکل ہے
اِس خصلت سے معذور ہیں ہم
منتر جاننے والوں کی محتاجی پر مجبور ہیں ہم

شاہیں بھی ہیں چڑیاں بھی ہیں
انسانوں کی بستی میں
ان کو ناز بلندی پر
یہ نالاں اپنی پستی میں

شاہیں کو تادیب کرو
یا چڑیوں کو شاہیں کرو
یوں اِس باغِ عالم میں
آزادی کی تلقین کرو

بحرِ جہاں ہیں ظاہر و پنہاں انسانی گھڑیال بھی ہیں

طالبِ جان و جسم بھی ہیں

شیدائے جاہ و مال بھی ہیں

پیٹ پھٹے پڑتے ہیں اِن کے

یہ مُنہ پھاڑے بیٹھے ہیں

ہر بازار میں ہر منڈی میں

جھنڈے گاڑے بیٹھے ہیں

ان کی ہستی سے بستی ہے —— بستی قبرستانوں کی

ان کی توندیں قبریں ہیں

انسانوں کے ارمانوں کی

یہ انسانی ہستی کو سونے کی مچھلی جانتے ہیں

مچھلی میں بھی جان ہے

لیکن ظالم کب گردانتے ہیں

مزدوری کا تذکرہ چھوڑ دو

سرمائے کا ذکر کرو!

خون کی اِک اِک بُوند نچوڑ دو ان کے پیٹ کی فکر کرو

جائیں کہاں ہر سمت کھلے ہیں

مُنہ سرمایہ داروں کے

اِن کے مُنہ میں دانت نہیں

پھل ہیں خونی تلواروں کے

کھا جانے کا کونسا گُر ہے جو اِن سب کو یاد نہیں

جب تک اِن کو آزادی ہے

کوئی بھی آزاد نہیں

زر کا بندہ

عقل و خرد پر جتنا چاہے ناز کرے

مٹّی میں دھنس جائے

یا بالائے فلک پرواز کرے

اس کی آزادی کی باتیں

ساری جھوٹی باتیں ہیں

کھا جانے کی ترکیبیں ہیں

پی جانے کی گھاتیں ہیں

جب تک ایسے جانوروں کا ڈر

دنیا پر غالب ہے

پہلے مجھ سے بات کرے

جو آزادی کا طالب ہے

جھوٹی بسنت

قفس کے راحت پسند پنچھی مزے میں ہیں چہچہا رہے ہیں
چمن پہ آتش برس رہی ہے
بسنت کے گیت گا رہے ہیں
اُٹھے ہیں صیّاد لے کے پھندے قدم قدم پر بچھا رہے ہیں
خزاں رسیدہ چمن میں شاید
بہار کے دن پھر آ رہے ہیں
لگا کے آگ اِس چمن کے مالی جلا چکے پھول پات ڈالی
بہار کے اب فقط خیالی پُلاؤ بیٹھے پکا رہے ہیں

ہوا کے یہ سرد سرد جھونکے
یہ گرم گرم اشک بلبلوں کے
لگی ہوئی کو بجھا رہے ہیں، بجھی ہوئی کو جگا رہے ہیں

دبی ہوئی حسرتوں میں شاید
کہیں کہیں آگ لگ گئی ہے
گری ہوئی پتیوں کے تودے دھوئیں کے بادل اٹھا رہے ہیں

حفیظ صاحب سے کوئی کہہ دے
خزاں کی سختی کو بھول جائیں
ترانے گائیں غزل سنائیں جلی کٹی کیوں سنا رہے ہیں

گونجے ہوئے نغموں کی گونج

یہ نظم جو ۲۸ء میں لکھی اور مخزن میں شائع کی گئی تھی۔ شکر ہے۔ اب ہمعصروں کی زبان پر نئے نئے رنگ اختیار کر رہی ہے

شورشِ ہستی کا ہنگامہ ہے میرے سامنے
کشمکش کا محشر برپا ہے میرے سامنے

اک طرف سے آ رہی شادیانوں کی صدا
اک طرف فریاد ہے، غوغا ہے میرے سامنے

حاصلِ محنت خزاں و پائے لنگ و خار زار
رنگِ سرمایہ گُل اندر گُل بہار اندر بہار

سرنگوں و زار و نالاں، عاجزی مزدور کی
سرفراز و شاد و خنداں نخوتِ سرمایہ دار

ہاں یہ سب کچھ ہے مگر مجھ پر اثر کچھ بھی نہیں
سب اذیت جسم پر ہے روح پر کچھ بھی نہیں

زلزلے آئے تہ و بالا ہوا نظمِ جہاں
میری دنیائے سکوں زیر و زبر کچھ بھی نہیں

میں کسی بے اعتنائی پر بھی افسردہ نہیں — دوستوں کی بے وفائی پر بھی آزردہ نہیں
جب یہ حالت ہو گئی ہو قوّتِ احساس کی — پھر یہ کیسے مان لیں، زندہ ہوں میں مردہ نہیں

اب یہ فکرِ جام و بادہ گردشِ تقدیر ہے — فکر رنگیں ہو کہ سادہ، شعر بے تاثیر ہے
ہاں یہی نقاشیٔ فطرت ہے جو بے رنگ ہے — ہاں اسی عالم کا نغمہ، نغمۂ تصویر ہے

ڈھونڈ کر لاؤں کوئی ایسا مصوّر باکمال — جو مری آنکھوں میں کھینچے میری ہی تصویرِ حال
مُو قلم کی ٹھوکروں سے کام لے مضراب کا — جس سے آخر چیخ چیخ اُٹھّے مرا سازِ خیال

زندگی کا ساز چھیڑوں پھر نئے انداز سے — جس سے روحِ درد ہو بیدار خوابِ ناز سے
جاگ اٹھّے پھر مرے گونجے ہوئے نغمے کی گونج — راکھ میں شعلے بھڑک اٹھیں مری آواز سے

خُوب ہنسے گا دیوانہ

کدھر جاتا ہے دیوانے؟

خوب ہنسے گا دیوانہ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء

شعر کی تعریف میں یہ شرط بھی بیان کی گئی ہے۔ کہ اس کے موزوں ہونے میں شاعر کا ارادہ ضرور شامل ہو ——

اس لئے (دورانِ سیاحت کشمیر) ۳۱ اگست اور یکم ستمبر سنہ ۱۹۳۹ء کی درمیانی شب میں "اب خُوب ہنسے گا دیوانہ" لکھتے وقت میں اس شرط کا پابند تھا۔ اور مطمئن ہُوں۔ کہ یہ نظم فقط دیوانے کی ہنسی ہے۔ یعنی بے معنی ——

لیکن میرے بہت سے سخن سنج احباب کو اس میں معنی ہی معنی نظر آتے ہیں۔ مجھے ان کی سخن فہمی پر حسن ظن کا شک ہے۔ دیکھئے دُنیا کیا کہتی ہے۔

گرمی

اب سورج سر پر آدھمکے گا
ٹھنڈا لوہا چمکے گا

اور دھوپ جواں ہو جائے گی
سٹھیائے ہوئے فرزانوں پر
اب زیست گراں ہو جائے گی
اب اصل عیاں ہو جائے گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۲)

اب آگ بگولے ناچیں گے

سب لنگڑے لولے ناچیں گے

گرداب بلا بن جائیں گے

روندی ہوئی مٹّی کے ذرّے

طوفان بپا بن جائیں گے

صحرا۔ دریا بن جائیں گے

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۳)

اب سُستی جال بچھائے گی

اَب دَھونس نہ چلنے پائے گی

مزدوروں اور کسانوں پر

اب "سوکھا لہو" نچوڑنے والے

روئیں گے نقصانوں پر

ان کھیتوں اور کھلیانوں پر

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۴۸)

اب پیلی دھات کی بیماری

پھیلا نہ سکیں گے بیوپاری

لوہے کا لوہا مانیں گے

سونے کی گھری کانوں میں

سو جانا بہتر جانیں گے

در در کی خاک نہ چھانیں گے

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۵)

اب خُون کے ساگر کھولیں گے

انسان کے جوہر کھولیں گے

چڑھ جائے گی تپ صحراؤں کو

اُٹھے گی اُمنڈ کر لال آندھی

پی جائے گی دریاؤں کو

باندھے گا تُند ہواؤں کو

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۶)

ہر زلف سے بچھو لٹکیں گے

آنکھوں سے شرارے ٹپکیں گے

صیّادوں حسن شکاروں پر

پھوٹے گا پسینہ غصّے کا

موتی بن کر رخساروں پر

اس دھوپ میں چاند ستاروں پر

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۷)

اب دُودھ نہ دیں گی بھینسیں گائیں

اُف اُف کرنے لگیں گی مائیں

بچّے مَم مَم چیخیں گے

اب اُونگھنے والے نکھٹّو شوہر

"عقلِ مجسّم" چیخیں گے

سب دِرہم برہم چیخیں گے

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۸۱)

اب خانقہوں کی مُردہ اداسی
روزِ ازل کی بُھوکی پیاسی
جُھومے گی مے خانوں پر
اب ساقی۔ مغبچے۔ پیرِ مغاں
بیچلیں گے وعظ دکانوں پر
ان زہر بھرے پیمانوں پہ
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۹)

زورآوری سے کمزوروں کی
اب جیب کٹے گی چوروں کی
اور مُنڈی ساہوکاروں کی
اِک بھوکی "ہُو حق" سیر کرے گی
منڈیوں اور بازاروں کی
گت دیکھ کے دنیا داروں کی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

۱۰

جلینا۔ دِل گُردہ ڈھونڈے گا

ہر "زندہ مُردہ" ڈھونڈے گا

کوئی کونا کھدڑا تہ خانہ

اب ہر جنگل میں منگل ہو گا

ہر بستی میں ویرانہ

اِک نعرہ لگا کر مستانہ

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

سردی

اب جاڑا جھنڈے گاڑے گا

اور فیلِ فلک چنگھاڑے گا

اب بادل شور مچائیں گے

اب بھوت فلک پر چڑھ دوڑیں گے

دھرتی کو دہلائیں گے

ہنسنے کے مزے اب آئیں گے

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۱۲۱)

ایوان کریں گے بھائیں بھائیں
پھونس کی جھونپڑیوں میں ہوائیں
سائیں سائیں گونجیں گی
اِس گونج میں بھوکے ننگوں کی
سنسان صدائیں گونجیں گی
ویران سرائیں گونجیں گی
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۱۳۱)

اب بجلی کے کوڑوں سے ہوا

شمشیر بکف زنجیر بپا

لوہے کے رتھوں کو ہانکے گی

ایک ایک دھوئیں کے محمل سے

صد حُسن کی ملکہ جھانکے گی

اب آگ انگارے پھانکے گی

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۱۴۱)

اب ٹھنڈی آہوں کے پرنالے

پالے آفت کے پرکالے

گُندّے تو لے برسیں گے

اب آہن ٹھنڈا پڑ جائے گا

آہن کے گولے برسیں گے

ہر سر پر اولے برسیں گے

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۱۵)

تخریب کی توپیں چھوٹیں گی
تعمیر کی کلیاں پھوٹیں گی
ہر گورستانِ شاہی میں
بالائے ہوا ۔ زیرِ دریا
غُل ہوگا مُرغ و ماہی میں
اس نوآباد تباہی میں
اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۱۶۱)

اب ناگن بانہی گرمائے گی

سانپ کی لالی لہرائی گی

کالے آتشدانوں میں

دانائیاں کینچلی بدلیں گی

شہروں کے بندی خانوں میں

اور دُور کھلے میدانواں میں

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۱۷)

بھس خالی پیٹ میں بھر نہ سکے گا

کوئی تجارت کر نہ سکے گا

ٹکڑی ٹکڑی کھالوں کی

اب منڈھ بھی جائے تو بج نہ سکے گی

نوبت پیسے والوں کی

بے کاری پر دلّالوں کی

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۱۸)

اب دال نہ جاگیروں کی گلے گی

آگ مگر دن رات جلے گی

چمڑے کے تنّوروں میں

اب کال پڑے گا غلّے کا

بیوپاریوں بے مقدوروں میں

اور پیٹ بھرے مزدوروں میں

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

(۱۹)

اب گاڑھا پسینہ بننے والے

اوڑھے پھریں گے شال دوشالے

مُفت نہ جھولیں جُھولیں گی

پھُولے ہوئے گال اب پچکیں گے

پچکی ہوئی توندیں پھُولیں گی

سب عقلیں چوکڑی بھولیں گی

اب خوب ہنسے گا دیوانہ

کدھر جاتا ہے دیوانے!

بہت سی بستیاں ہیں محشرستاں سرد لاشوں کے
طلسمی کارخانے ملتی پھرتی زرد لاشوں کے

بہت سی وادیوں میں رنگِ ہستی ننگِ ہستی ہے
جہاں اُفتاد ہی اُفتاد ہے پستی ہی پستی ہے

بہت سی محفلیں ہیں بے زبانی کے عزاخانے
جہاں بیچارگی کہتی ہے محرومی کے افسانے

بہت سی خلوتوں میں جرم ہے اقدام سرگوشی
مسلسل ایک سناٹا مسلسل ایک خاموشی

بہت سے دل ہیں جن میں کوئی کروٹ ہے نہ انگڑائی
بہت آنکھیں ہیں اب تک جن میں بینائی نہیں آئی

یہ لاتعداد فرزانے ہیں غیر آباد ویرانے!
بہت سا کام باقی ہے کدھر جاتا ہے دیوانے!

وہ پیارے جو سوئے عدم جا چکے ہیں

تاریخیں یاد نہیں رہیں۔

آغا حشر کاشمیری

سر راس مسعود

علّامہ اقبال

آغا حشر کاشمیری کی موت پر

حشر کا بھی کام پورا ہو گیا
لو یہ ہنگامہ بھی آخر سو گیا
اور اک روشن ستارہ ٹوٹ کر
رات کی تاریکیوں میں کھو گیا

ختم ہوتی جا رہی ہے زندگی
موت کو شرما رہی ہے زندگی

ہے اگر مرنا بھی جینے ہی کا نام
زندگی کو کھا رہی ہے زندگی

کس قدر آباد ہے دنیائے دوں
مُردہ و افسردہ و خوار و زبوں
خاک کا پیوند ہونے کے لیے
صورتِ اشکِ ندامت سرنگوں

اہلِ دل کی زندگی ہے زندگی
روح کی تابندگی ہے زندگی
ہو گئے رخصت جہاں نور و سرور
کچھ نہیں شرمندگی ہے زندگی

حیف وہ آنکھیں جو مے خانہ نہیں
خاک اُس دل پر جو پیمانہ نہیں
موت ہے نشّہ اُتر جانے کا نام
زندگی جز رقصِ مستانہ نہیں

حشر تھا ہنگامۂ عیش و نشاط
اِک تلاطم خیز موجِ انبساط
آسمانوں کو تہ و بالا کرے
اے خُدا۔ اِک آدمی کی یہ بساط!

عاقلی فرزانگی کی بات ہے
عاشقی دیوانگی کی بات ہے

عاقلی۔ اُس پر مسلسل عاشقی
واقعی مردانگی کی بات ہے

کون ہے جو حشر کا ہو جانشیں
عرش ہو جس کے تخیّل کی زمیں
نعرہ زن ہو گنبدِ افلاک پر
ہے کوئی ایسا۔؟ نہیں کوئی نہیں

کون عاقل ہے جو دیوانہ بنے
غمکدے میں غم سے بیگانہ بنے
زندگی جس کی حقیقت ہو حفیظ
اور مر جائے تو افسانہ بنے

بہ یادِ سیّد راس مسعود

یہ ہست و نیست ۔ یہ "ہے اور نہیں" ۔ یہ بود و نبود
خدا ہی جانے خدا کو ہے اس سے کیا مقصود

نہاں ترنّمِ بلبل میں نالۂ ماتم
عیاں تبسّمِ گل سے ہے چشمِ اشک آلود

کمالِ عقل جہالت ۔ مآلِ عشق جنوں
مثالِ حُسن ہے شعلہ ۔ زوالِ شعلہ ہے دُود

"زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است"
اِسی کا نام ہے دنیا ۔ یہی ہے بزمِ شہود؟

گناہگار ہوں بے شک اُس ایک ساعت کا
کہ اک نظارۂ دلکش سے رُوح تھی خوشنود
دو جلوے مجھ کو نظر آئے ایک صورت میں
وہ عشق و عقل کہ دنیا سے آج ہیں مفقود
وہ جس کی ذات میں زندہ تھا عشقِ سرسیّد
وہ جس کی بات میں قائم تھی دانشِ محمود
وہ اِک نمونۂ اخلاص و پیکرِ ایثار
جسے نہ ذوقِ نمائش نہ شوقِ نام و نمود
وہ عزم حوصلہ مند اَور وہ نگاہِ بلند
وہ طبع فقر پسند و مزاج قلزمِ جُود
مری جبینِ عقیدت کو چُومنے والا
مرا شفیق۔۔ مرا قدرداں۔ مرا مسعود

وہ ایک دارِ اماں تھا مرا بروئے زمیں
وہ اک پناہ تھی میری بزیرِ چرخِ کبود
میں اس کی بزم میں آیا تو اُٹھ گیا وہ بھی
طلب نے ہاتھ بڑھایا تو کچھ نہ تھا موجود
شریکِ بزمِ وجود آج بھی ہوں ہیں لیکن
نہیں ہوں اپنی خوشی سے شریکِ بزمِ وجود
خدا و خلق سے جب تک ہے واسطہ اے دوست
نہ خامشی کی اجازت نہ اذنِ گفت و شنود
حفیظ مرگِ احبّا کے بعد زندہ ہوں
یہ زندگی ہے کہ پابندئ رسوم و قیود!

اقبال کی زندگی میں"

اِک تھکا ہارا مسافر ہوں۔ اندھیری رات ہے
کوئی سنگی ہے نہ ساتھی بس خدا کی ذات ہے
کارواں۔ غولانِ صحرائی کو "رہبر" مان کر
ہو چکا گمراہ۔ گمراہی کو منزل جان کر
ہمرہوں کے اِس چلن سے دامنِ دل چاک ہے
آہ۔ اِس اقدام کا انجام عبرت ناک ہے
دیدہ ہائے غول کو سمجھے چراغاں کی بہار
توڑ کر عزمِ سفر۔ سب چھٹ گئے پروانہ وار

جانتا ہوں اس روش کی پیروی بے سود ہے
اب مجھے تنہا تلاشِ منزلِ مقصود ہے
پیچھے پیچھے شور و شیون کی صدا سُنتا ہوا
آگے آگے جا رہا ہوں اپنا سر دھنتا ہوا
وادیِ ظلمات ہے کوئی نہیں ہے رہنما
ابر سے پیدا و پنہاں ہے ستاروں کی ضیا
اِک ستارا اِن ستاروں میں مرا دمساز ہے
نور اُس کا۔ میری اپنی روشنی کا راز ہے
ایک سیلابِ بقا ہے یا رواں ہے زندہ رود
میری فطرت سُن رہی ہے اس کا نورانی سرود
اِس کا دامانِ ضیا تو دسترس سے دور ہے
دور کے جلوے سے ہاں! میری نظر معمور ہے

کیا یہی تابندگی پنہاں مرے سینے میں ہے؟
یا اِسی کا عکس میرے دل کے آئینے میں ہے؟
ناظرِ جلوہ ہے وہ میں طالبِ نظارہ ہوں
عرش پر اس کی نظر میں فرش پر آوارہ ہوں
تاہم اک نسبت تو اس اختر کو میرے دل سے ہے
واسطہ دونوں کا شائد ایک ہی منزل سے ہے
ہے ازل کی اِس غلط بخشی پہ حیرانی مجھے
عشق لافانی ملا ہے۔ زندگی فانی مجھے
جس طرف جاتا ہے وہ اس سمت راہی میں بھی ہوں
طالبِ نظّارہ ہائے صبحگاہی میں بھی ہوں

یہ رہِ تاریک یہ محدود بینائی مری
یہ سفر۔ یہ رات کا عالم۔ یہ تنہائی مری
اور گھر کر آرہی ہیں کالی کالی بدلیاں
چھا گئی ہیں بجلیاں چمکانے والی بدلیاں
ہوتی جاتی ہے فضا کچھ اور بھی تاریک و تار
سنگ قدموں سے الجھنے لگ گئے۔ دامن سے خار
ہوتا جاتا ہے گھنا جنگل گھنیرا اور بھی
بجلیاں چمکیں تو بڑھتا ہے اندھیرا اور بھی
خیرگی میری دلیلِ راہ بن سکتی نہیں
بجلیاں انوارِ مہر و ماہ بن سکتی نہیں

سُن رہا ہوں بھیڑیوں کی غرفشیں غرّاہٹیں
آتی ہیں کانوں میں دل دہلانے والی آہٹیں
چار سو غولوں کی آنکھیں آگ بھڑکاتی ہوئی
ٹولیاں بھوتوں کی ہنستی بولتی گاتی ہوئی
اور دیوانی ہوا بھی چیختی چنگھاڑتی
رقص کرتی۔ خاک اُڑاتی۔ گردِ دامن جھاڑتی
پرخطر ماحول ہے لیکن چلا جاتا ہوں مَیں
وادیٔ پُرہول ہے لیکن چلا جاتا ہوں میں
اِس سفر میں چلتے جانے کے سوا چارہ نہیں
شکر ہے ذوقِ یقیں میرا تھکا ہارا نہیں

رفتہ رفتہ سب ستارے بدلیوں نے چھا لیے
نور پارے کالی کالی ڈائنوں نے کھا لیے

ہاں فقط میرا ستارا آشکارا ہے ابھی
اِس زمیں پر آسمانی اِک سہارا ہے ابھی
تیز پا تاریک عفریتوں سے ٹکراتا ہوا
چل رہا ہے نور برساتا ہوا گاتا ہوا
ہر قدم پیغام ملتا ہے ستارے سے مجھے
سو تسلی مل رہی ہے اِک اشارے سے مجھے
کہہ رہا ہے کیا ہوا گھاٹی اگر تاریک ہے
صبحِ صادق منزلِ مقصود بھی نزدیک ہے
تو اگر گرمِ سفر ہے۔ راستہ کٹ جائے گا
آسماں سے ابرِ ظلمت بار بھی چھٹ جائے گا
امتحاں رکھے گئے ہیں جن کی راہوں کے لیے
جلوہ خود بےتاب ہے ان کی نگاہوں کے لیے

اے مرے پیارے ستارے میرے نورانی رفیق
ذرۂ خاکی ہوں میں لیکن ہوں تیرا ہم طریق
دیکھ۔ میری آنکھ سے اوجھل نہ ہو جانا کہیں
اس ہجومِ ابر میں مجھ سے نہ کھو جانا کہیں
تو اگر چاہے تو حاضر سینہ ہے تیرے لیے
یہ مری آنکھیں نہیں ہیں۔ زینہ ہے تیرے لیے
میرے دل میں بیٹھ۔ مجھ کو سوئے منزل لے کے چل
ناخدا ہے تو۔ یہ کشتی تا بہ ساحل لے کے چل
تیرا درسِ زندگی میرا شریکِ حال ہے
اے مرے روشن ستارے تو مرا اقبال ہے

اقبال کی خبرِ مرگ سُن کر

غم حوصلہ مند ہو گیا ہے — دل صبر پسند ہو گیا ہے

دریا دریا تھے میرے آنسو — اب چشمہ ہی بند ہو گیا ہے

جل جاتا ہے اشک سوزِ دل سے — یہ قطرہ سپند ہو گیا ہے

کیا لطف ہے ایسی زندگی کا — ہر سانس گزند ہو گیا ہے

اُڑنے کا قفس سے ہر بہانہ — پرواز پرند ہو گیا ہے

گردن کے لیے یہ رشتۂ عمر — واللہ کمند ہو گیا ہے

غم کھانے کی ہو چکی ہے عادت
یہ زہر بھی قند ہو گیا ہے

اندازِ حیات و مرگِ اقبال
میرے لیے پند ہو گیا ہے

یہ کس کو خبر تھی وصل کا شوق
پہلے سے دو چند ہو گیا ہے

شاہینِ زمیں فلک پہ خورشید
بھرتے ہی زقند ہو گیا ہے

اقبال بلند تھا ہمارا
اب اور بلند ہو گیا ہے

اقبال کے مزار پر

لحد میں سو رہی ہے آج بیشک مشتِ خاک اس کی
مگر گرمِ عمل ہے جاگتی ہے جانِ پاک اُس کی

وہ اِک فانی بشر تھا میں یہ باور کر نہیں سکتا
بشر اقبال ہو جائے۔ تو ہرگز مر نہیں سکتا

بزیرِ سایۂ دیوارِ مسجد ہے جو آسودہ
یہ خاکی جسم ہے ستّر برس کا راہ پیمودہ

یہ خاکی جسم بھی اس کا بہت ہی بیش قیمت تھا
جسے ہم جلوہ سمجھے تھے وہ پردہ بھی غنیمت تھا

اسے ہم ناپتے تھے لے کے آنکھوں ہی کا پیمانا
غزل خواں اُس کو جانا ہم نے شاعر اس کو گردانا
فقط صورت ہی دیکھی اس کے معنی ہم نہیں سمجھے
نہ دیکھا رنگِ تصویر آئینے کو دل نشیں سمجھے
ہمیں ضعفِ بصارت سے کہاں تھی تابِ نظّارا
سکھائے اس کے پردے نے ہمیں آدابِ نظارا
یہ نغمہ کیا ہے زیرِ پردہ ہائے سازِ کم سمجھے
رہے سب گوش بر آواز لیکن راز کم سمجھے
شکستِ پیکرِ محسوس نے توڑا حجاب آخر
طلوعِ صبحِ محشر بن کے چمکا آفتاب آخر
مقیّد اب نہیں اقبال اپنے جسمِ فانی میں
نہیں وہ بند حائل آج دریا کی روانی میں

وجودِ مرگ کی قائل نہیں تھی زندگی اس کی
تعالی اللہ اب دیکھے کوئی پائندگی اُس کی

جسے ہم مُردہ سمجھے زندہ تر پائندہ تر نکلا
مہ و خورشید سے ذرّے کا دل تابندہ تر نکلا

ابھی اندازہ ہو سکتا نہیں اس کی بلندی کا
ابھی دنیا کی آنکھوں پر ہے پردہ فرقہ بندی کا

مگر میری نگاہوں میں ہیں چہرے ان جوانوں کے
جنہیں اقبال نے بخشے ہیں بازو قہرمانوں کے

رہنما

جستجو تے رہنما جانے دے ۔ اے عزم سفر!

اب تو جگنو بھی نظر آنے لگے تابندہ تر

کرمکِ شب ۔ تابِ مہر و ماہ بن سکتے نہیں

یہ مسافر کے دلیلِ راہ بن سکتے نہیں

اِتنے دُنبالوں کے پیچھے دوڑنا بے سُود ہے

روشنی اِن کی ۔ انہی کی ذات تک محدُود ہے

جوانی کے منصوبے

برات

درشن

(۱) سنہ ۱۹۴۵ء میں نامکمل سنائی گئی سنہ ۴۶ء میں مکمل ہوئی

(۲) سنہ ۱۹۴۴

(۳) پہلا بند سنہ ۱۹۳۷ء میں دوسرا سنہ ۱۹۴۶ء میں

"جوانی کے منصوبے" عنوان محمود نظامی (ریڈیو)
کی طرف سے ارشاد و استفسار تھا اور نظم
تعمیل و جواب۔

جوانی کے منصوبے

درد سے ہے لبریز پیالہ
ہوگیا بے کیفی کا ازالہ
میرا قفلِ خموشی ٹوٹا
قید سے چھوٹے نغمہ و نالہ

اب کی مرتبہ اک عالم کو
سوجھا ہے مضمون نرالا
میری جوانی کے منصوبے
پوچھ رہا ہے پوچھنے والا

مقصد یہ ہے اپنی ہستی   جگ کو پھر اک بار سُنا دوں
میں یہ دکھڑے رو تو چکا ہوں   کیوں نہ کلام اپنا دُہرا دوں

میری جوانی کے منصوبے   میرا سخن میری تحریریں
میرے ارادوں کے افسانے   میری حسرت کی تصویریں

تو یہ سمجھا میں نے شاید   لطف کی بات چھُپا رکھّی ہے
آنسوؤں کی تلخی کے سوا بھی   اور کوئی لذّت چکھّی ہے

تو یہ سمجھا میری جوانی   اک بدمست جوانی ہو گی
رندی کا اک دریا ہو گا   دریا میں طغیانی ہو گی

اِک مے خانہ ہوگا جس میں بھاری بھاری مٹکے ہوں گے
دیکھ کے میری بادہ پرستی زاہدوں کے مُنہ لٹکے ہوں گے

تو یہ سمجھا میری لتکیں ناچ رنگ کی محفل ہوگی
اور اس منصوبے کی تہ میں کوئی حور شمائل ہوگی

حُسن کی منڈی میں بھی شاید میرا آنا جانا ہوگا
رقّاصہ کی چاہت ہوگی مطرب سے یارانہ ہوگا

کوئی ایک پری بھی ہوگی میرے خوابوں کی محبوبہ
جس کو اُڑا کر لایا ہوگا میری جوانی کا منصوبہ

یا اک حسن رہگزر پر　　میں نے ڈالے ہوں گے ڈورے
میری بھونڈی گردن ہوگی　　اُس کے بازو گورے گورے

تیری منشا یہ ہے میں بھی　　چند افسانے گھڑ کے سناؤں
لڑکوں کو ترغیب گُنہ دوں　　ہڈی بوڑھوں کی گرماؤں

تو سچّا ہے تو نے دیکھا　　کچھ بھی نہیں جُز نفس پرستی
جس کے بیاں سے پا لیتے ہیں　　ہلکے شاعر شہرت سستی

ڈھونڈ لے کوئی رنگیں شاعر　　جو بن پیئے نہ رہ سکتا ہو
آگ نہ جب تک پیٹ میں اُترے　　منہ سے حرف نہ کہہ سکتا ہو

جس کے منہ کا حرف ہو گالی
ناموسِ اشراف کے حق میں
جس کو شن کہ فرق نہ سوجھے
پاجی۔ شاعر یا احمق ہیں

اہلِ نظر سے آنکھ چرائے
عاجز اور نا اہل ہو فن سے
نافہموں کی بزم میں جائے
نام اُچھالے مسخرہ پن سے

قہقہوں کو تحسین سمجھ لے
سر کو ہلائے۔ نشے میں جھومے
محنت کا حامی کہلائے
سرمائے کی چوکھٹ چومے

خون پیئے مزدور کا دن کو
رات کوئی مزدورنی تاکے
جس کی جوانی کا منصوبہ
اکثر پلٹے جوتے کھا کے

اپنے بیوی بچّے تج کر — چوک میں گھومے بن کر چھیلا
جس محفل جس بزم میں پہنچے — مُنہ سے نکلے وے لا وے لا

فرش سے اُچھلے ذکرِ خدا پر — عرش پہ جھپٹے گھولنے تانے
خبطی ہے یہ ہر کوئی سمجھے — چاہتا کیا ہے کوئی نہ جانے

جس کے شعر میں ہو بے ربطی — جس کے مضموں ہوں بازاری
جس کی منزل ہو بد راہی — جس کا مقصد ہو بدکاری

اپنی ملّت کا ہو دشمن — گانٹھے غیروں سے یارانہ
طعن کرے پاکانِ سلف پر — بہرِ حصولِ آب و دانہ

باہر سے ابلہ نظر آئے اندر سے ہو پکّا شاطر
دکھلائے ہر کھیل مداری اپنے پاپی پیٹ کی خاطر

ایسا شاعر ڈھونڈ لے پیارے اُس سے رونقِ محفل ہوگی
اُس کی جوانی کے منصوبے سُن کر دنیا خوش دل ہوگی

جس مسلک پر میں ہوں۔ اس میں رندی کو ترجیح نہیں ہے
میری جوانی کے قصّے میں سامانِ تفریح نہیں ہے

میری جوانی ہندوستانی بے چاری مجبور جوانی
قوم و وطن کے درد میں شامل آزادی سے دُور جوانی

میری جوانی نے بھی دیکھے — جوشِ ہوس کے یہ نظارے
شرم نے لیکن پھیر لیں آنکھیں — ہوتے رہے گو لاکھ اشارے

میری جوانی کے منصوبے — شیدائے تحصیلِ ہنر تھے
جب میں جواں تھا میرے رہبر — اہلِ دل تھے اہلِ نظر تھے

جب بھی اکثر ہمعصروں سے — میر النصب العین جُدا تھا
یعنی شرمِ خلق تھی مجھ کو — یعنی مجھ کو خوفِ خُدا تھا

برات

روح مجروح۔ تن بدن مفتوح
واہ وا۔ کیا حیات پائی ہے

ابرِ راحت کا جس پہ سایہ ہو
دن ملا ہے نہ رات پائی ہے

حوصلے تھے بہت مگر سب نے
رفتہ رفتہ وفات پائی ہے

تابِ نظارہ پائی ہے لیکن
قیدِ شش جہات پائی ہے

کائنات اپنی جانتا ہوں میں
بس یہی کائنات پائی ہے

وادیِ اشک آفریں ہے جہاں — بارشِ واردات پائی ہے
پا چکا ہوں وہ دردِ دل جس نے — مجھ میں بھی کوئی بات پائی ہے
یاد ہے جس کو دوست کا احساں — ایک اپنی ہی ذات پائی ہے
غم نہیں ہے کہ موت سے میں نے — راحتِ التفات پائی ہے

اے خوشا یہ شکستِ کعبۂ دل — دولتِ سومنات پائی ہے
مل گیا ہے نشانِ منزلِ دوست — جستجو سے نجات پائی ہے
یہ شبِ زندگی ہے صبحِ مراد
تیرگی میں برات پائی ہے

درشن درشن میرا

بس

درشن درشن میرا
مالی لاکھ کرے رکھوالی
بھونرا گونجے ڈالی ڈالی
پھول پھول پر ڈیرا
بس
درشن درشن میرا
ہر کوئی ہے قیدِ قفس میں بلبل رنگ میں مکھی رس میں
اپنا من ہے اپنے بس میں
جوگی والا پھیرا
بس
درشن درشن میرا

درشن درشن میرا

بس

درشن درشن میرا

جس ہردے میں شیام براجے

جس گوکل میں مُرلی باجے

سادھو کریں بسیرا

بس

درشن درشن میرا

رنگ رنگ سے جلوے جوالا انگ انگ کا رُوپ نرالا

نَین جپیں درشن کی مالا

ساجے سانجھ سویرا

بس

درشن درشن میرا

عزم اشتراک

خون کے چراغ

"عزمِ اشتراک" سنہ ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی
"خون کے چراغ" سنہ ۱۹۴۶ء میں مکمل ہوئی

عزمِ اشتراک

برفانی پہاڑوں پر چڑھتے ہوئے روسی رضاکاروں کا نعرہ

بن کے بیٹھے ہیں یہ مغرور یہاں صاحبِ تاج
دیوتاؤں سے بشر کو ابھی لینا ہے خراج
المدد ۔ المدد اے جذبۂ دشوار پسند!
قلّۂ کوہ ذرا اور بلند اور بلند
باد و باراں سے کہو جوشِ جوانی دکھلائیں
طبع حاضر ہو تو کچھ اپنی روانی دکھلائیں
سر پہ ہر ایک بلا آئے دمِ سر بازی
ژالہ کیا بامِ فلک سے ہو کلوخ اندازی

آسمانوں سے یخ بستہ چٹانوں کا نزول
سرد مہری بھی یہ منظور - یہ سختی بھی قبول
اُمڈے سیلاب کہ طوفان قیامت توڑے
اُس پہ لعنت ہے جو منہ راہِ طلب سے موڑے
ہم اولوالعزم ہیں - پیچھے نہیں ہٹنے والے
اور ہوں گے کوئی رستے سے پلٹنے والے
مٹ گئے ہم تو یہ کام اور بشر کر لیں گے
کوہ کیا چیز ہیں - افلاک کو سر کر لیں گے
بن کے بیٹھے ہیں جو مغرور یہاں صاحبِ تاج
دیوتاؤں سے بشر کو ابھی لینا ہے خراج

خون کے چراغ

سُرخ پھولوں سے زمینِ کشمیر کی ہے سُرخرو

لالہ بن کر پھوٹ نکلا ہے شہیدوں کا لہو

چھوٹے چھوٹے ڈھیر مٹی کے قطار اندر قطار

راہِ آزادی میں لڑنے مرنے والوں کے مزار

معرکہ اِس خاک پر گزرا ہے دار و گیر کا

لالہ زار اس کو نہ سمجھو۔ کھیت ہے شمشیر کا

یہ ہماری جاودانی زندگانی کے نشاں

چاند تاروں کی طرح روشن ہیں زیرِ آسماں

خوشنما چنڈول اُڑتے اور لہراتے ہوئے
چہچہاتے آسمانی راگنی گاتے ہوئے
کوئی یہ نغمے شہیدوں کے سوا سنتا نہیں
جنگِ آزادی میں اب تک محو ہیں اہلِ زمیں
اِک طرف بھوکی رعایا ۔ اک طرف جاگیردار
اِک طرف دہقان ۔ اِک جانب سپاہِ شہریار
بیکسوں کی آہیں مظلوموں کی چیخیں دردناک
شورِ محشر ہے ۔ کہ ہم بھی سُن رہے ہیں زیرِ خاک
حملہ آور ہیں نہتوں پر مسلّح جنگ جو
آبِ جہلم کی رگیں ہیں اور کشمیری لہُو
یہ لہو جتنا بہے گا رنگ لاتا جائے گا
راہِ آزادی میں تازہ گُل کِھلاتا جائے گا

تا بکے آتش سے کھیلے گی کرائے کی یہ فوج
قلزمِ جمہور میں جاگی ہے آزادی کی موج

فطرتِ انساں کو ہے طوقِ غلامی ناپسند
حرّیت اُٹھی ہے لے کر، پرچمِ عزمِ بلند

اُٹھے ہیں مزدور جانبازی دکھانے کے لئے
لعنتِ سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے

ان کے چہرے ہیں مرقعے جوش و ضبط و صبر کے
توڑ ڈالیں گے یہ سب آئین ظلم و جبر کے

حسنِ نصب العین ہو جن کی نگاہوں پر نثار
ہم شہیدوں کی نگاہیں ان کی راہوں پر نثار

اے رفیقو۔ سرفروشو۔ سنتے جاؤ ایک بات
ہم بھی زندہ تھے کبھی۔ ہم کو بھی پیاری تھی حیات
دیکھتے تھے ہم بھی صبح و شام کی رنگینیاں
اِن نگاہوں نے بھی کی ہیں حُسن کی گلچینیاں
ہم بھی ان سینوں میں دل رکھتے تھے دل میں درد بھی
گرم آنسو آنکھ میں۔ ہونٹوں پہ آہِ سرد بھی
دل دھڑکتا تھا ہمارا بھی نگاہِ ناز پر
رقص ہم بھی کر چکے ہیں زندگی کے ساز پر
ہم نگاہِ حُسن کے طالب بھی تھے مطلوب بھی
عِشق ہم نے بھی کیا تھا ہم بنے محبوب بھی
ہم تمہاری ہی طرح کُودے تھے اس طوفان میں
جان کی بازی لگا دی ہم نے اس میدان میں

تھے غلامی سے تمہاری ہی طرح بیزار ہم

جنگِ آزادی کے تھے پہلے علم بردار ہم

تھا پرِ پرواز اپنا بھی کبھی افلاک پر

آج ہم قبروں میں ہیں۔ سوتے ہیں فرشِ خاک پر

جسم ہیں سوئے ہوئے جانیں مگر بیدار ہیں

اشتراکی اہلِ ہمت کے لئے تیار ہیں

معرکہ آراؤ۔ ہاں آگے بڑھو۔ بڑھتے چلو

غاصبوں پر تُند شیروں کی طرح چڑھتے چلو

اب تمہارے ہاتھ اس آغاز کا انجام ہے

ہم یہاں کام آ گئے۔ آگے تمہارا کام ہے

زور و زر سے مکر و حیلہ سے نہ شور و شین سے

موجِ آزادی نہ کترائے گی نصب العین سے

مُنہ اگر آزادیٔ کشمیر سے موڑو گے تم

ہم شہیدوں ۔ ہم وفاداروں کے دل توڑو گے تم

لالہ رُو یہ تربتیں یہ سینہ ہائے داغ داغ

ہم نے اپنے خُون سے روشن کئے ہیں یہ چراغ

سرفروشو ۔ اِن چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے!

آگے ۔ اور آگے بڑھو ۔ نامِ خدا لیتے ہوئے!

چند غزلیں چند شعر

عرفات میں

اے مرے آقا۔ میرّہ از خطا تُو ہے کہ مَیں؟

بخشش دینا کام کس کا ہے، خدا تو ہے کہ مَیں؟

منزلِ مقصد نہیں ملتی تو اب مَیں کیا کروں

راہ تیری ہے کہ میری۔ رہنما تُو ہے کہ مَیں

مدینے کی راہ پر

راہ پر آ ہی گئی گردشِ ایّام آخر

ہو گیا روئے سفر سوئے مدینہ میرا

معجزہ جس نے نہ دیکھا ہو وہ مجھ کو دیکھے

کس طرح ڈوب کے اُبھرا ہے سفینہ میرا

یہ کشتی کون ڈبوتا ہے

کیوں ہجر کے شکوے کرتا ہے کیوں درد کے رونے روتا ہے
اب عشق کیا ہے تو صبر بھی کر۔ اس میں تو یہی کچھ ہوتا ہے

آغازِ مصیبت ہوتا ہے اپنے ہی دل کی شرارت سے
آنکھوں میں پھول کھلاتا ہے۔ تلووں میں کانٹے بوتا ہے

احباب کا شکوہ کیا کیجے۔ خود ظاہر و باطن ایک نہیں
لب اوپر اوپر ہنستے ہیں۔ دل اندر اندر روتا ہے

ملاحوں کو الزام نہ دو تم ساحل والے کیا جانو
یہ طوفاں کون اٹھاتا ہے۔ یہ کشتی کون ڈبوتا ہے

کیا جانیے یہ کیا کھوئے گا۔ کیا جانیے یہ کیا پائے گا
مندر کا پجاری جاگتا ہے مسجد کا نمازی سوتا ہے

مجھے منظور نہیں

حُسن پابندِ رضا ہو مجھے منظور نہیں
میں کہوں تم مجھے چاہو۔ مجھے منظور نہیں

پھر کبھی خبطِ وفا ہو۔ مجھے منظور نہیں
پھر کوئی دوست خفا ہو مجھے منظور نہیں

جس نے اس دور کے انسان کئے ہیں پیدا
وہی میرا بھی خُدا ہو مجھے منظور نہیں

شرط اظہارِ ندامت ہے جو بخشش کے لئے
اسے جرأت کے گنا ہو مجھے منظور نہیں

حشر کے دن مجھے سچ کہنے کی توفیق نہ دے
کوئی ہنگامہ بپا ہو مجھے منظور نہیں

حسن والے میرے قاتل ہیں یہ دعویٰ ہے مرا
حُسن والوں کو سزا ہو مجھے منظور نہیں

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یارب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

اب کوئی راز نہیں۔ اب سے مرا محرمِ راز
کوئی بھی میرے سوا ہو مجھے منظور نہیں

جلوے لاکھوں ہیں خدا ایک ہے اے سجدۂ شوق
ہر قدم لغزشِ پا ہو مجھے منظور نہیں

مجھ کو اے کاتبِ تقدیر تماشا نہ بنا
عشق چہرے پہ لکھا ہو مجھے منظور نہیں

یہ بُری بات ہے۔ ترغیبِ گنہ دل کو نہ دو
میری معصوم نگاہ ہو مجھے منظور نہیں

اے بتو تم پہ اندھا دُھند مرے خلقِ خُدا
اور خدا دیکھ رہا ہو مجھے منظور نہیں

حرم و دیر کو بندوں سے ہے جو کچھ مقصود
یہی مقصودِ خُدا ہو مجھے منظور نہیں

تیرے کردار سکندر تیری رفتار خضر
تو مرا راہنما ہو مجھے منظور نہیں

خفگی میکدہ والوں کی۔ الٰہی توبہ!
کوئی خوش ہو کہ خفا ہو مجھے منظور نہیں

چند اہلِ دل سمجھتے ہیں

حسینوں کو ہم اپنے قتل میں شامل سمجھتے ہیں
مگر وہ اور کوئی ہے۔ جسے قاتل سمجھتے ہیں

ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں خدا کو ماننے والے
بتانِ ہند جن کو دید کے قابل سمجھتے ہیں

ہوئے ہیں شیخ جب سے معتکف بتخانے کے اندر
انہیں ہم جیتے جی فردوس میں داخل سمجھتے ہیں

خدا رکھے ہمارے ناخدا ہیں موج کے بندے
جہاں خود ڈوبنا چاہیں وہیں ساحل سمجھتے ہیں

پگھلتی جائیں شمعیں اور جلتے جائیں پروانے
اسی کو اہلِ محفل گرمیٔ محفل سمجھتے ہیں

وفا کے مسئلے میں کہہ گئے اِک حرفِ حق ہم بھی
ہمارے دوست ہم کو دار کے قابل سمجھتے ہیں

بڑھو ہمّت کرو۔ اندھے گڑھے میں جھانکنے والو
تمہارے رہنما تم کو سرِ منزل سمجھتے ہیں

بیانِ درد پر اہلِ زباں سے داد ملتی ہے
زبانِ درد لیکن چند اہلِ دل سمجھتے ہیں

حفیظ اپنی ترقی شعر میں یہ ہے۔ کہ اس فن کو
بہت آسان سمجھے تھے۔ بہت مشکل سمجھتے ہیں

اور جینا چاہتا ہوں

نہ پیتا ہوں نہ پینا چاہتا ہوں
سخن کا اک قرینا چاہتا ہوں
نگاہ و دل کی یک رنگی تھی درکار
وہ سمجھے جام و مینا چاہتا ہوں
مرا مقصود پردہ ہے نہ جلوہ
فروغِ چشمِ بینا چاہتا ہوں
نہ توڑو دوستو رشتہ وفا کا
میں دل کے زخم سینا چاہتا ہوں
ابھی باقی ہے میعادِ مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

چوب خشک

میرا مزاج پوچھتے ہو بار بار کیا!
اپنی نگاہ پر بھی نہیں اعتبار کیا؟
اب سازگار کیا مجھے ناسازگار کیا!
میں چوب خشک۔ میری خزاں کیا بہار کیا!

خدا بھی ساتھ ہے

ہوا کو دیکھ ناخدا محل نہیں غرور کا
تو ساتھ ساتھ ہے تو کیا۔ خدا بھی ساتھ ساتھ ہے
اٹھا ہے دھوم دھام سے جنازہ میرے عشق کا
حسیں بھی ساتھ ساتھ ہیں وفا بھی ساتھ ساتھ ہے

غرور

میری آنکھوں کو نور ملے نہ ملے
میرے دل کو سرور ملے نہ ملے
مگر اتنا غرور ضرور ملے
کہ جھکے میری لوحِ جبیں نہ کہیں

مجھے دامِ وفا میں پھنسا کے رکھو
تہِ دامنِ لطف چھپا کے رکھو
میرے عشق کی ہو نہ کسی کو خبر
مجھے دیکھ لے کوئی حسیں نہ کہیں

ختم دوسرا ایڈیشن
آغاز طباعت ۱۹۴۶ء تکمیل اپریل ۱۹۴۷ء

۳۰۴

تلخابۂ شیریں

ابوالاثر حفیظ جالندھری

قیمت غیر مجلد چار روپے   ملنے کا پتہ مجلس اردو ماڈل ٹاؤن
لاہور

ملنے کا پتہ

شیخ برکت علی اینڈ سنز تاجران کتب

کشمیری بازار لاہور